ہندوستان کے مسلمان

امتیازی سلوک کا شکار

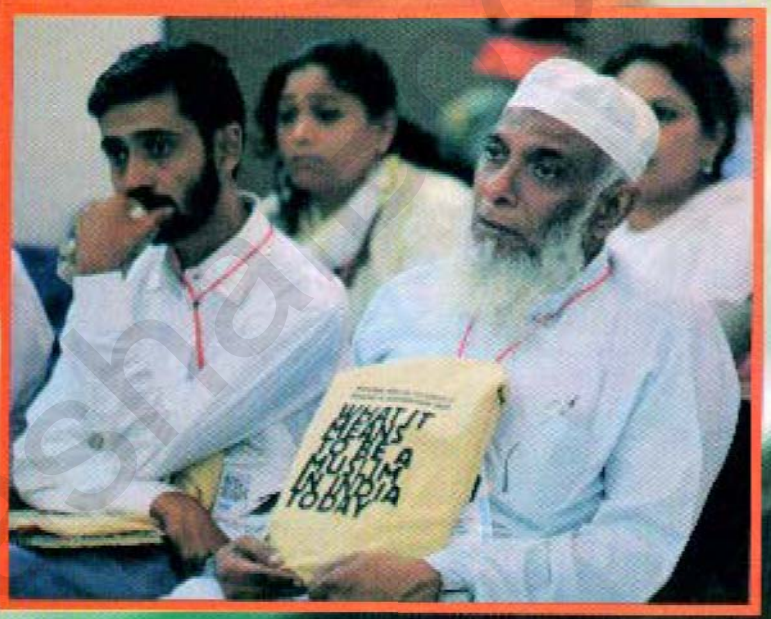

امت پانڈیا ترجمہ: محمد اختر

مشعل

MashalBooks.org

1

ہندوستان کے مسلمان

امتیازی سلوک کا شکار

امت پانڈیا

ترجمہ: محمد اختر

مشعل بکس

آر بی۔ ۵، سکینڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

۵۴۶۰۰ پاکستان

MashalBooks.org

2

ہندوستان کے مسلمان

امتیازی سلوک کا شکار

امت پانڈیا

اردو ترجمہ: محمد اختر

کاپی رائٹ انگریزی (c)2010امت پانڈیا
کاپی رائٹ اردو (c)2011 مشعل بکس

ناشر: مشعل بکس
آر۔ بی۔ ۵۔ سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک،
نیو گارڈن ٹاؤن لاہور 54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

فہرست

تعارف ۵

وسیع تر تناظر ۱۰

ایک مختلف قسم کی اقلیت ۱۴

مذہبی اور قومی تشخص ۱۶

سیاسی شراکت ۲۱

تشدد، انتہا پسندی اور ریاست ۲۵

ریاست اور معاشرہ ۳۱

سماجی اور معاشی نقصانات ۳۹

تعلیم، تشخص اور اختیار ۴۶

غیر یقینی اعداد و شمار ۵۱

ان کی اپنی آواز میں ۵۳

مسلمانوں کا ثقافتی، نظریاتی اور سماجی تنوع ۶۰

اپنی مدد آپ اور ذمہ داری کی روح ۶۶

احیاء العلوم (نشاۃ ثانیہ) ۷۰

معاشی حالت ۷۳

طرز سیاست ۷۶

معیاری تعلیم ۔۔۔۔اعلیٰ ترین ترجیح ۸۴

قانون کی حکمرانی ۸۸

اردو زبان ۹۴

جنس ۹۷

ذرائع ابلاغ، مقبول تاثر اور اس کی رسائی ۹۹

MashalBooks.org

تشدد ۱۰۲
حاصل بحث ۱۰۷

MashalBooks.org

تعارف

سٹمسن سنٹر / انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز اینڈ کونفلکٹ ریزولیوشن سٹڈی

ہنری ایل سٹمسن سنٹر واشنگٹن ڈی سی اور انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز اینڈ کونفلکٹ ریزیولوشن ممبئی نے دسمبر2007ء سے ایک جامع انکوائری کا اہتمام کیا جس کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی ترجیحات، سوچ اور تحفظات کو بہتر انداز میں سمجھنا اور بیان کرنا تھا۔ ہم نے اس سٹڈی کا اہتمام اس لیے کیا کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ مسلم ہندوستانیوں کی رائے کو مناسب طریقے سے سمجھا نہیں گیا۔ مسلمانوں کے مسائل اور تحفظات کو بہتر طریقے سے نمٹانے کے سلسلے میں ہندوستان میں پالیسیوں کی تیاری کے لیے پہلے ضروری ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں رہنے والے مسلمانوں کے تجربات کو واضح طور پر سمجھا جائے۔ ہندوستانی آبادی کے بڑے اور اہم حصے اور عالمی مسلم کمیونٹی کی سوچ اور مسائل کے بارے میں ایک واضح فہم حاصل کرنے کی صورت میں امریکی پالیسیوں کو بھی اچھے طریقے سے مرتب کرنے میں مدد ملے گی۔

اس میں سکیورٹی کے سلسلے میں پالیسیوں سے متعلقہ افراد کے لیے اضافی دلچسپی کا امر ریاست مخالف عناصر اور متشدد پان اسلامی نیٹ ورکس کی وہ مخفی اپیل ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کے نقصان کی قیمت پر پل رہی ہے۔ اس بات کے کوئی شواہد موجود نہیں کہ متشدد اور انتہاپسند پان اسلامی نظریات ہندوستان کے مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر پھیل یا جڑ پکڑ چکے ہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر بہت سے ہندوستانی جن میں مسلم بھی ہیں اور غیر مسلم بھی اور جن کا تعلق ہر قسم کے نظریات اور مختلف پیشوں سے ہے، اس کے امکانات پر اپنے خدشات کا اظہار کر چکے ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی خلیج بھی اس کے امکان میں اضافہ کرے گی۔

MashalBooks.org

مزید برآں مسلم رائے عامہ کی اصل صورتحال سامنے نہ ہونے کی وجہ سے یہ موضوع قیاس آرائیوں کا مرکز بن سکتا ہے اور بن چکا ہے جو کہ اپنے سیاسی مضمرات کے حوالے سے خطرناک ہے۔مسلم کمیونٹی میں بنیاد پرستی میں اضافے کے حوالے سے کسی قسم کے اندازے لگانے سے مسلمانوں کے خلاف پالیسیوں اور رویے میں سختی ہوجائے گی اوراسے بہانہ بنالیا جائے گا۔اس سے مسلمانوں کے خلاف مسائل میں اضافہ ہوگا جو پہلے ہی مسائل سے دوچار ہیں بلکہ اس سے بنیاد پرستی اور سخت جذبات کا اظہار بڑھ جائے گا جس کا اکثر خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے۔اسی کے ساتھ بنیاد پرستی کی حقیقی حد یا مسلمانوں کی تنہائی اور مارجنلائزیشن میں اس کی بنیادی وجوہات کے بارے میں سمجھنے میں ناکامی کی صورت میں پیچیدگیوں میں اضافہ ہوگا اور ان بنیادی وجوہات سے نمٹنے میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا جو کہ ان کی تنہائی اور مارجنلائزیشن کا سبب ہیں۔

ہم نے اس سلسلے میں کالی کٹ، احمد آباد، جے پور، دہلی، علی گڑھ، کولکتہ، گوہاٹی، بنگلور، حیدرآباد اور چنائی میں نصف نصف دن پر مبنی فوکس گروپس مباحث کا اہتمام کیا۔ممبئی اور لکھنو میں دو دو علیحدہ سیشن کیے۔ان فوکس گروپ مباحث میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد پندرہ سے ساٹھ کے درمیان رہی۔ان اجلاسوں کے بعد2010ء کے اوائل میں دہلی میں ایک قومی اجلاس ہوا جس میں ان تمام اجلاسوں کے قومی مضمرات پر بحث کی گئی جو کہ ہرصوبائی فوکس گروپ میں کیے گئے تھے۔اس قومی اجلاس میں تیس افراد نے شرکت کی جنہیں صوبائی فوکس گروپس کے اجلاسوں میں شرکت کرنیوالوں میں سے چنا گیا تھا۔ان اجلاسوں میں شرکت کرنے والوں میں مرد، عورتیں، سوشل ورکر، سیاسی لیڈر، مذہبی لیڈر، سوشل سروس پرووائیڈر، کاروباری حضرات، اساتذہ، فلسفیوں، سائنسدانوں، قانون دانوں، ڈاکٹروں، انجینئروں، مذہبی سکالراور عام آدمیوں نے شرکت کی۔

ہم نے ہندوستان بھر میں عام ہندوستانی مسلمانوں جن میں ورکراور خود ملازم شامل تھے، اس کے علاوہ اوپر بیان کیے گئے پیشوں کے حوالے سے اضافی لوگوں سے بھی بات کی۔ہم نے سینئرترین سرکاری افسروں، عام لوگوں اور محنت مزدوری کرنے والوں سمیت ہر سطح کے مسلمانوں سے بات کی۔

لوگوں کو انٹرویو کے لیے منتخب کرنے کے حوالے سے ہم نے اس بات کو خاص طور پر

یقینی بنایا کہ ہمیں ایسی گفتگو اور نقطۂ نظر سننے کو ملے جو کہ فوکس گروپ مباحث میں موجود نہیں تھے۔ ہر انٹرویو اور فوکس گروپ میں ہم نے گذشتہ مباحث سے ملنے والے مرکزی خیالات پر آراء کو حاصل کیا۔ چنانچہ اس پورے دوسالہ پراسس کو مجتمع اور جاری سنگل ڈسکشن کے طور پر دیکھا جائے جسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔فوکس گروپ مباحث اور ساتھ ہی انفرادی نقطۂ نظر حاصل کرنے سے ہم اس قابل ہوئے کہ یہ جان سکیں کہ بحث یا اتفاق رائے کی صورت میں مختلف نقطۂ نظر اور تجربات کے حامل مسلمان ایک دوسرے سے کیا کہتے ہیں۔کمیونٹی کے اندر سے ان کے خیالات جاننے کا جو موقع ہمیں ملا وہ بہت بیش قیمت رہا۔

فوکس گروپس کے لیے مدعو کیے گئے افراد اور انٹرویو کے لیے منتخب کردہ افراد کی جو فہرستیں تیار کی گئیں ان میں اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ ان میں زیادہ سے زیادہ مختلف پس منظر کے حامل افراد کو لیا جائے تا کہ مسلمانوں کی سامنے آنے والی سوچ نہ صرف درست ہو بلکہ ہر ممکن تفصیلی طور پر سامنے آئے۔ہم نے جہاں تک ممکن ہوسکا بحث میں نمائندگی کے سلسلے میں وسیع ترین تنوع پیدا کیا جس میں فرقہ ورانہ شناخت سے لیکر مذہبی اور سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ پیشوں، معیشت اور پیش ورانہ پس منظر کا بھرپور تنوع قائم کیا۔فوکس گروپ کی تشکیل کا دارومدار ان مقامات پر ہوتا تھا جہاں یہ منعقد کیے جاتے تھے۔ہم نے ہر جانب سے لوگوں کی رائے لی اور ان کے ساتھ مباحث کا اہتمام کیا اور ان سے سیاسی فلسفوں بشمول لبرل سیکولر، عسکریت پسند، اسلامسٹ، نسائی علمبردار، مذہبی سکالرز سے لے کر انتہائی قدامت پرست اور انتہائی آزاد خیال نقطۂ نظر کے حامل افراد، معاشی پوزیشنز کے حامل افراد سے لیکر بقاء کی جدوجہد کے تجربات اور، ریڈیکل سوشل نظریات کے حامل ہر قسم کے افراد شامل تھے جن سے ہم نے جامع انداز میں بات کی۔

اگرچہ ہم نے جن موضوعات کو اٹھایا اور بات کی ان کے بارے میں نظریاتی نقطۂ نظر اور شرکاء کی تدبیراتی فکر میں وسیع پیمانے پر تنوع پایا گیا تاہم ہندوستان کے مسلمانوں کے بنیادی مسائل کے حوالے سے ایک قابل ذکر اتفاق رائے پایا گیا۔

ہمیں یہ امر بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ہماری سٹڈی میں ہندوستان کے دیہاتی علاقوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ اگرچہ ہمارے شرکاء بحث براہ راست تجربات اور مشاہدات کے ذریعے ہندوستان کے دیہاتوں کی صورت حال سے اچھی طرح واقف تھے تاہم ہمارا فیلڈ ورک مکمل

طور پر ہندوستان کے شہروں اور قصبوں تک محدود تھا اور اس میں سامنے آنے والے زیادہ تر نقطۂ نظر شہری ہے۔

ہم یہ بھی بتادیں کہ ہم نے اس سٹڈی میں ایک مسلم اکثریت والی ہندوستانی ریاست جموں و کشمیر کو دانستہ طور پر شامل نہیں کیا باوجودیکہ ہم نے وہاں کا دور ہ بھی کیا اوروہاں ماحولیاتی تبدیلیوں اور معاشی رجحانات کا مطالعہ کیا۔ کشمیری مسلمان خود کو ہندوستان کے دیگر مسلمانوں کے ساتھ شناخت نہیں کرتے۔ خودمختاری اور ریاست کے رتبے کے حوالے سے ان کا کوئی بھی موقف ہو، وہ جغرافیے کی رو سے قومی یا نیم قومی ثقافت اور تاریخ کے لحاظ سے خود کو منفرد سمجھتے ہیں۔ فوکس گروپس اور انٹرویو کے موقع پر یہ بات واضح تھی کہ دیگر ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے مسئلے اور کشمیری مسلمانوں کی فلاح و بہبود کو ''سوئی جینرز'' (خاص اور منفرد مسئلہ) کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جزوی طور پر وہ تنازعے کے منفرد تاریخی اور جغرافیائی پہلو و کشمیریوں کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ وہ اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کشمیر پر پائی جانے والی پاکستان ہندوستان دشمنی وسیع تر ہندوستانی سماج میں ان کے اپنے مقام کو اور بھی متنازعہ بنادے گی جس سے دائیں بازو کے ہندوؤں کے اس الزام کو مزید تقویت ملے گی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت انٹی نیشنل یا خفیہ طور پر پاکستان کی ہمدرد ہے۔

MashalBooks.org

وسیع تر تناظر

''میں مسلمان ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔اسلام کی تیرہ سو سالہ شاندار روایت میرا ورثہ ہے۔ اسلام کی روح میری رہنمائی کرتی ہے اور مجھے آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔مجھے ایک ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ میں اس ناقابل تقسیم وحدت کا حصہ ہوں جو ہندوستانی قومیت ہے۔ میں اس عالیشان عمارت کا ناگزیر حصہ ہوں اور میرے بغیر ہندوستان کی شاندار عمارت نامکمل ہے۔میں وہ بنیادی عنصر ہوں جسے ہندوستان کو تعمیر کرنا ہے۔ میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔''

مولانا ابوالکلام آزاد

مسلمان ہندوستانیوں کے بارے میں ایک روایتی تصور ہے کہ وہ ایک غیر متحرک اور خاموش اقلیت ہیں جو موجودہ زمانے کے غیر مسلم ہندوستان میں سکون کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان جس طرح باقی ملک کے ساتھ ہم آواز ہیں یا وہ جس طرح ایک سیکولر لیکن ہندو انہ کلچر میں مدغم ہوچکے ہیں اس پر غیر ہندوستانی مسلمان ان کی طرف حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک جانب تو ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف مقدمات کی صورت میں ان کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری جانب وہ اس وقت اطمینان کا اظہار کرتے ہیں جب یہی ہندوستانی مسلمان پان اسلامی کاز جیسے فلسطین وغیرہ سے یکجہتی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لیکن وہ مسلمان ہندوستانیوں کو ایک ایسی طاقت کے طور پر کم ہی دیکھتے ہیں جسے مسلم امہ کے ساتھ شمار کیا جائے۔

ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ مسلمان مفکرین اور سکالرز خود کو ایک وسیع تر تناظر کے ساتھ

MashalBooks.org

دیکھتے ہیں۔ وہ ایک ہزار سالہ تہذیب کے وارث ہیں جو کہ جدید تاریخ کی عظیم ترین تہذیب ہے جس کا دامن فلسفے، طرز تعمیر، آرٹ اور ادب کی عظمتوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تہذیب ہے اسے دنیا بھر کے مسلمانوں کی جانب سے اسلامی تہذیب میں جڑے ایک موتی کی طرح دیکھا جاتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تقسیم کے نتیجے میں پہلے دو اور پھر تین قوموں کے وجود میں آنے تک اسلامی دنیا میں یہ بلاشبہ ایک عظیم ترین نہیں تو عظیم تہذیب کا درجہ ضرور رکھتی تھی۔

مسلم ہندوستانی بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ جس طرح ایک جغرافیائی، تاریخی، علمی اور ثقافتی تعلق محسوس کرتے ہیں اس کی سیاسی حیثیت بہت نازک ہے۔ یہ ہندو انتہا پسندوں کے لیے ایک آسان نشانہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں یا الزام عائد کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان ''قوم مخالف'' ہیں کیونکہ وہ اندر خانے پاکستان کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے لیے ہندوستانی شناخت سے زیادہ مسلم شناخت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن جہاں تک ثقافتی اور مذہبی فکر کی بات ہے تو جنوبی ایشیائی مسلمانوں کی حیثیت سے جو ورثہ ان کے پاس ہے وہ ان کے لیے فخر کا باعث ہے۔ یہ اسلام کی ایک منفرد اور لبرل شکل ہے جو کہ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور تاریخی تجربات سے مخصوص قسم کی خصوصیات حاصل کرتا ہے۔ جنوبی ایشیا کے مسلمان کسی بھی اسلامی خطے کے مقابلے میں زیادہ بڑا اور ثقافتی گروپ تشکیل دیتے ہیں۔

اسلام کا اثاثہ اور ایرانی اور وسطی ایشائی ثقافت کا امتزاج وسیع ہندوستانی قومی تاریخ، ثقافت اور تہذیب کے ناقابل تقسیم حصے کے طور پر برقرار رہتا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے سلسلے میں بھی مسلمان ہندوستانی ناگزیر تھے اور اس وقت ہندوستان میں جو ایک کثیر المذہبی سیاسی اور ثقافتی شناخت تھی اور آج کے ہندوستان کی جو ثقافتی اور علمی شناخت ہے اس کا بھی ناگزیر حصہ ہیں۔ ہندوستانی مسلمان ایک مشکل توازن کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ایک جانب تو وہ اپنے مذہبی اور ثقافتی ورثے اور اس وسیع قومی کلچر پر فخر کا احساس رکھتے ہیں جو انہوں نے تشکیل دیا ہے اور دوسری جانب یہ اسلام ہی تھا جس نے 1947ء میں ان کے وطن کا بٹوارہ کیا تھا۔ ہندوستانی مسلمان اپنے ہندوستانی ہونے پر بھی فخر کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے تقسیم کے باوجود نئے ملک پاکستان میں ہجرت کرنے کے بجائے

کثیر المذ ہبی ہندوستان میں رہنے کو ترجیح دی۔

لیکن انفرادی کامیابیوں کے باوجود مسلمان ایک گروہ کے طور پر آزاد ہندوستان میں خوشحالی حاصل نہ کر سکے۔حال ہی میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان کے باہر بھی یہ تشویش جنم لے چکی ہے کہ معاشی، سماجی اور ثقافتی طور پر مارجنلائز شہریوں کی ایک بڑی آبادی کا وجود قومی یک جہتی کے لیے بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ہی سیاسی اور سماجی طور پر بھی عدم استحکام کا منبع بن سکتا ہے۔بعض حلقوں کا خدشہ ہے کہ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں جو ریاست مخالف اور پان اسلامی نظریات تیزی سے بڑھ رہے ہیں اس کی وجہ ان میں پایا جانے والا محرومی اور ناراضگی کا احساس ہے اور جو متشدد گروہ ان نظریات سے متاثر ہو رہے ہیں وہ بھی مستقبل میں مسائل کو جنم دے سکتے ہیں۔

اگر چہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی (سولہ کروڑ) لگ بھگ پاکستان کی آبادی کے قریب قریب اور بنگلہ دیش کے برابر جبکہ کئی غالب اکثریت والے مسلمان ملکوں (جیسے مصر کی آبادی آٹھ کروڑ ہے) سے بہت زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود بھارت کے مسلمان نسبتاً کم پڑھے لکھے اور ناخواندہ ہیں۔ان کے محسوسات اور خراب حالات کو غیر ہندوستانی تو دور کی بات ہندوستانی غیر مسلموں میں بھی کم ہی سمجھا جاتا ہے۔ان میں یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ بھارت بھر میں مختلف النوع مسلمان کمیونٹیز میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس حوالے سے بھی بے بس ہیں۔

MashalBooks.org

ایک مختلف قسم کی اقلیت

ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کے حوالے سے جو غیر رسمی اور غیر سرکاری اعداد وشمار ہیں وہ بہت متفرق ہیں اوراس حوالے سے مسلمانوں کے حامیوں اور مخالفین میں خاصی تکرار پائی جاتی ہے2001ء کی مردم شماری کے حوالے سے ایک تخمینے کے مطابق ان کی آبادی سولہ کروڑ کے لگ بھگ ہے جو کہ کل آبادی کا13.5 فیصد ہے۔آبادی کے یہ اعداد وشمار کہاں تک درست ہیں ؟یہ بھی بذات خود ایک ایسا سوال ہے جس پر بہت تنازعہ پایا جاتا ہے جو اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو جس ناگوار صورتحال کا سامنا ہے اس کے بارے میں بھی کس قدر تنازعہ ہوگا۔مسلم مخالف دائیں بازو والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان کی کل آبادی کا تیس فیصد تک ہوچکے ہیں جس سے ایک قسم کا اضطراب ظاہر ہوتا ہے یا پھر ایسا کرکے شاید دانستہ طور پر خطرے کی گھنٹی بجائی جاتی ہے کہ آیا مسلمان ایک روز بھارت کی ہندوآبادی کو ہی اقلیت میں بدل دیں گے اور یوں ان کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیں گے۔انتہا پسند مسلمان حلقوں کا یقین ہے کہ اصل اعدادوشمار سرکاری اعداد وشمار سے دوگنا ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کی آبادی کو جان بوجھ کر کم ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھا جاسکے۔ذمہ دار مسلمان حلقے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی کل بھارتی آبادی کا بیس فیصد ہے۔بہرحال کچھ بھی کہا جائے یہ حقیقت تو روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان ہندوستان میں دوسرا سب سے بڑا مذہبی گروہ اوردنیا کی سب سے بڑی مسلمان اقلیت ہیں۔

ان کی آبادی کتنی ہے؟ اس سے قطع نظر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حیثیت ہے وہ

MashalBooks.org

اس حقیقت سے پھوٹتی ہے کہ موجودہ ہندوستان میں ایک اقلیت ہونے کے باوجود وہ ایک ایسی سیاسی تاریخ کے وارث ہیں جو ان طاقتور مسلم سلطنتوں پر مشتمل تھی جو طویل عرصے سے ہندوستان پر غالب رہی تھیں۔ وہ ایسی ثقافتی روایات کے امین ہیں جن کا ماخذ مقامی بھی ہے اور وسط ایشیائی بھی۔اور یہ وہی رنگ ہے جو آج کی جدید ہندوستانی شناخت میں بھی دکھائی دیتا ہے۔صرف بیسویں صدی کے وسط میں قیام پاکستان سے پہلے تک غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان کل آبادی کا ایک تہائی تھے۔

لہذا ہندوستان میں مسلمان خود کو اس طرح ایک اقلیت کے طور پر نہیں دیکھتے جس طرح دوسری اقلیتیں دیکھتی ہیں۔ہندوستان ان کا ہے اور وہ اس ملکیت اور تعلق کا پورا احساس رکھتے ہیں۔تاہم مسلم مخالف دائیں بازو کے انتہا پسند ہندو گروہوں کے سامنے آنے کے بعد ان میں بے چینی کا احساس بھی بڑھ رہا ہے۔ جہالت اور روایتی تصورات کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف تعصب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

MashalBooks.org

مذہبی اور قومی تشخص

اگرچہ برصغیر میں مسلمان ہمیشہ ایک اقلیت کے طور پر ہی رہے ہیں لیکن جس وقت یہاں پر انگریزوں نے بتدریج قبضہ کیا تو ہندوستان پر مسلم اشرافیہ کی حکومت تھی۔مختلف نسلوں کے مسلمان (ترک اور ایرانی) اور سلطنت دہلی اور مغلوں کی شکل میں مسلم خاندان گذشتہ چھ سات سو سال سے ہندوستان پر حکومت کررہے تھے۔ کئی علاقوں (جو پاکستان کا حصہ بنے) میں مسلمان ویسے ہی اکثریت میں تھے اور یہاں پر جو ہندو کلچر تھا اس پر بھی مسلمانوں کی علمی اور ثقافتی چھاپ نمایاں تھی۔کئی ایسے علاقے بھی تھے جو براہ راست مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں تھے لیکن اس کے باوجود ان پر مسلمانوں کے اثرات تھے کیونکہ وہاں پر اشرافیہ میں مسلمان بھی شامل تھے اور آبادی میں مسلمان اقلیت کے طور پر بھی موجود تھے جس کی وجہ سے خوراک، فنون لطیفہ، تعمیرات حتیٰ کہ مذہبی فکر میں بھی مسلمانوں کے ملے جلے اثرات شامل تھے۔

لگ بھگ ایک صدی تک ہندوستان میں مذہبی شناخت تقسیم کا باعث رہی۔ ہندوستان کو اس وقت بیرونی طور پر سلامتی کے جن چیلنجوں کا سامنا ہے ان کے حوالے سے کسی بھی قسم کی فیصلہ سازی میں اسلام کے اس کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو ان ملکوں کے قیام میں شامل ہے جن پر جنوبی ایشیا مشتمل ہے۔لیکن جہاں تک مسلمانوں میں علیحدگی پسندی اور قوم پرستی کی بحث ہے اس حوالے سے مسلمان دونوں اطراف سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ برطانیہ سے آزادی کے لیے ایک قومی تحریک کی تیاری کے موقع پر تمام قوم پرست تحریکوں کو جس سوال کا سامنا تھا وہ یہ تھا: بھارتی قومی

شناخت کی بنیاد کیا ہے؟ اس حوالے سے تین قسم کے افکار سامنے آئے۔

سیکولر قوم پرست جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے جو ایک مشترکہ کاز رکھتے تھے کے مطابق ہندوستانی کلچر ان کی قومی شناخت ہے جس کی بنیاد پر آزادی کی جدوجہد تشکیل دی جانی چاہیے اور ایک قومی طرز حکومت کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ ہندوستانی رائے عامہ میں انہیں ایک غالب اکثریت حاصل تھی۔

دوسرے ہندوستانی مذہبی قوم پرست تھے جو دیش کی آزادی میں ایک ایسا موقع دیکھ رہے تھے جس میں وہ ہندوستانی تہذیب کی عظمت کو بحال کرسکیں اور ایک ہندو خصوصیات کا حامل طرز حکومت تشکیل دیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کی پیروی کے لیے آزاد ہوں گے لیکن وہ ایک ایسی ریاست میں رہیں گے جہاں صرف ہندو کلچر ہوگا۔

دوسری جانب مسلمان قیادت کے ایک حصے نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے جداگانہ مفاد کی بنیاد پر مسلم لیگ کو منظم کیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ نمائندہ جمہوریت کا حصہ بننے کی صورت میں مسلمان اقلیت کے طور پر نقصان میں رہیں گے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل پاکستان اور ہندوؤں کی اکثریت پر مشتمل ہندوستان کا قیام عمل میں آیا۔ اس عرصے سے پہلے اور اسکے دوران اور بعد ازاں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے کے خلاف خونریز تشدد کا مظاہرہ کیا۔

برصغیر کی تقسیم کے سلسلے میں مسلمانوں کو جس مشکل کا سامنا کرنا پڑا ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مسلمان آبادی کا ایک بڑا حصہ ہندوستان کے ایسے علاقوں میں آباد تھا جہاں وہ اقلیت میں تھے اور یوں یہ علاقے ہندوستان کا حصہ بنے۔ جو علاقے پاکستان کا حصہ بنے وہاں بھی ہندو اقلیت میں آباد تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اگرچہ برصغیر کی تقسیم کی تحریک میں حصہ لینے والے مسلمان غالب حد تک سیکولر رجحانات کے حامل تھے لیکن نئے ملک پاکستان میں مذہب ایک اہم حقیقت بن گیا اور تشدد اور عدم رواداری کے نتیجے میں جو تھوڑے سے ہندو اس علاقے میں آباد تھے وہ بھی ہندوستان کو ہجرت پر مجبور ہوگئے۔

مذہبی تشخص کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم کے ضمن میں جو حساس صورت حال درپیش تھی وہ انتہائی پیچیدہ نوعیت کی تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں نہ صرف برصغیر مسلم اور غیر مسلم ریاستوں میں

تبدیل ہوگیا بلکہ اس کے نتیجے میں خود مسلمان آبادی بھی تقسیم ہوگئی اور ہندوستان میں اس کا اثر ورسوخ، شراکت اور اہمیت سب کم ہوگئے۔ مزید براں مسلمان جس طرح سمجھتے تھے کہ ایک الگ وطن بنا کر وہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرسکیں گے اس سے تقسیم کے بعد بھارت میں مقیم مسلمانوں کی پوزیشن کو نقصان پہنچا۔ ہندوستان میں ان کی کم تعداد اور ہندوستانی ریاست کے سیکولر ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مفادات کو زک پہنچی۔

یہ امر بھی زیادہ حیران کن نہیں کہ مذہبی ہندو قوم پرستوں نے ہندو اکثریتی ہندوستان کی تقسیم کی مخالف کی تھی۔ اس میں بھی حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ سیکولر مسلمانوں اور ہندوؤں نے مشترکہ ہندوستانی شناخت اور کلچر کو مسترد کرنے کی مخالفت کی۔ جو بات قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی اور عسکری سیاسی قیادت نے بھی تقسیم کی مخالفت کی جیسے جمعیت علمائے ہند نے انٹی سامراج جدوجہد سے اپنے شدید لگاؤ کے باعث ایسا کیا جبکہ دیگر جیسے جماعت اسلامی نے اس بنیاد پر تقسیم کی مخالفت کی کہ ایسا کرنے سے مسلمان تقسیم ہوجائیں گے اور یوں ہندوستان میں اسلام اور مسلمان دونوں کمزور ہوں گے۔ اس طرح محبّ وطن اور ثقافتی طور پر احساس تفاخر رکھنے والے مسلمانوں میں یہ سوچ پائی جاتی تھی کہ ہندوستان ان کا وطن ہے۔ اسی سوچ کی عکاسی آج کے دارالعلوم دیوبند مدرسے کی فکر سے ہوتی ہے جو یہ کہتی ہے کہ پان اسلامی نظریے کے حامیوں کے برعکس ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالامن ہے جہاں جہاد کی ضرورت نہیں۔ یہ مدرسہ ہندوؤں کو کافر قرار دینے کی بھی مخالفت کرتا ہے۔

برصغیر کی تقسیم اور پاکستان اور بھارت کے قیام کے موقع پر ایک مشترکہ ملاجلا ہندوستانی کلچر ایک زندہ حقیقت تھا۔ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمان بطور ہندوستانی ایک ایسی تہذیت پر فخر کرنے میں حق بجانب تھے جس کی اعلیٰ ترین ثقافتی، مذہبی اور سیاسی کامیابیوں میں مسلم اثرات کا ایک ناقابل تردید حصہ شامل تھا۔ ہندوؤں نے بیشتر اوقات مسلم اثرات کے ان عناصر کو گلے لگایا تھا جس نے ان کی تہذیب کو منور کیا تھا۔ اشرافیہ کی سطح پر مسلمان اور ہندو آپس میں گھلے ملے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کی تقریبات میں پورے ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں کا احترام کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی صوفیاء کے مزاروں کا احترام کیا جاتا تھا اور بعض اوقات تو ہندو اور مسلمان ایک

دوسرے کے مذہبی تہواروں کو بھی مناتے تھے۔

شاید اس وقت کا عظیم ترین حوالہ یہ حقیقت تھی کہ جس سیکولر ہندوستانی قوم پرست تحریک نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی کوشش کی اس کی سینئر قیادت میں مسلمان شامل تھے۔انڈین نیشنل کانگرس کے مولانا آزاد، شمال مغربی سرحدی صوبہ میں پٹھانوں کے غیرمتنازعہ اخلاقی اور سیاسی رہنما عبدالغفار خان اور آزاد ہندوستان کے تیسرے صدر ذاکر حسین جیسے رہنماؤں نے نہایت غیر مبہم انداز میں یہ واضح کیا کہ ہندوستانی قوم پرستی مسلمانوں کے لیے بھی اسی طرح قابل فخر ہے جس طرح ہندوؤں کے لیے ہے اور یہ کہ آزاد بھارت میں مسلمانوں کے لیے برابری کی جگہ ہے۔

MashalBooks.org

18

سیاسی شراکت

وسیع تر ہندوستانی قومیت کے احساس کے ساتھ جڑے مسلمان آزادی کی تحریک کا اٹوٹ انگ تھے۔ تقسیم کے بعد انہوں نے سیکولر سیاسی تناظر میں مسلمانوں کو قیادت اور نمائندگی فراہم کی۔ ان کی کم ہوچکی تعداد اور مسلمان کی حیثیت سے آزادی کی تحریک میں ان کی شمولیت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تشدد اور منقسم مسلمان خاندانوں کے صدمے نے اتحادی سیاست کی راہ ہموار کی۔ تاہم وقت گذرنے کے ساتھ مسلمانوں اور ریاست کے درمیان رابطوں اور بات چیت میں مسلم اور غیر مسلم ہندوستانیوں کو درپیش مشترکہ مسائل کے بجائے مسلمانوں کے منفرد مفادات اور ان کے الگ مذہبی تشخص کی بات پر زیادہ زور دیا جانے لگا جیسے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وراثتی اور فیملی قوانین کا اجراء وغیرہ۔

آزادی کے کئی عشروں بعد انڈین نیشنل کانگرس پارٹی غالب رہی اور سیکولر روایات کے ساتھ قوم پرست مسلمانوں کا تاریخی تعلق بھی کانگرس کے ساتھ رہا۔ کانگرس کی جانب سے مسلمانوں کو محض ''ووٹ بینک'' سمجھنے کے حوالے سے ہمیشہ ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوتا رہا۔ مسلمانوں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہورہا اور انہیں محض ٹوکن کے طور پر رعایات دی جارہی ہیں جبکہ کانگرس کے اندر اور باہر دونوں جگہ صرف ہندو رائے عامہ کے عناصر کو ہی خوش کیا جارہا ہے۔ کانگرس کی سیاسی اجارہ داری کے خاتمے کے بعد مسلمان ووٹرز اور رہنماؤں نے مسلمانوں کی طاقت اور اثر ورسوخ میں اضافے کے لیے اتحادی سیاست کے امکانات کو دریافت کیا۔ تاہم پارٹی پالیٹیکس کے عدم استحکام نے مسلمان قیادت اور نمائندگی کو کمزور کیا۔ کمیونسٹ حکم رانی والی ریاستوں اوران ریاستوں جہاں کمیونسٹ پارٹیوں کی بھرپور موجودگی تھی جیسے مغربی بنگال اور کیرالہ وغیرہ میں ایسی مخصوص

صورت حال نہ تھی ۔ اگر چہ کمیونسٹ پارٹیوں اور حکومتوں نے مسلمانوں کے مفادات کا دیگر پارٹیوں کے مقابلے میں موثر طریقے سے دفاع کیا لیکن حالیہ مقالات سے پتہ چلا کہ سینئر مسلمان رہنماؤں کو ان کے تناسب کے مطابق مرکزی سیاسی دھارے میں شامل نہیں کیا گیا اور کمیونسٹوں نے بھی دیگر ہندوستانی سیاست دانوں کی طرح ٹوکن ازم کی سیاست کا مظاہرہ کیا۔ حالیہ برسوں کے دوران کمیونسٹ پارٹی پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے سخت مذہبی، انٹی سیکولر اور منقسم مسلمان سیاسی تحریکوں اور رہنماؤں جیسے کیرالہ میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی کے عبدالناصر مدنی وغیرہ کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے انتخابی فائدہ حاصل کیا۔ دیگر نے یہ دیکھا کہ صورت حال اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ کہ مذہبی انتہاپسند عناصر معاشی اور سماجی طور پر ناانصافی سے دوچار ہندوستانیوں کے ساتھ ریڈیکل نوعیت کے اتحاد بنانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر مدنی کی پارٹی پی ڈی پی جس کا دعویٰ ہے کہ اس کا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دلتوں اور دیگر پسماندہ ذاتوں کے ساتھ بھی اتحاد ہے۔ یہ چیز مدنی کے ارتقائی عمل کی عکاسی کرتی ہے کہ جنہوں نے پہلے محض مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ہندوؤں کی راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ کی طرز پر اسلامی سیوا سنگھ پارٹی بنائی اور پھر اس میں دلتوں اور دیگر پسماندہ زاتوں کو بھی شامل کرلیا۔

2009ء کے الیکشن کے نتائج ہمیں موجودہ مسلم سیاسی رویے کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اگر چہ واضح طور پر ان الیکشنوں میں یہ دکھائی دیا ہے کہ مسلمانوں میں دوبارہ کانگرس کی طرف واپسی کا خاطر خواہ اور مسلسل رجحان پایا گیا ہے تاہم ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا سیاسی رویہ حالات کے مطابق مختلف رہا ہے۔ جن ریاستوں جیسے دہلی، گجرات، راجھستان اور مدھیہ پردیش میں دائیں بازو کی ہندو نواز بھارتیہ جنتا پارٹی اور کانگرس کے درمیان مقابلہ تھا وہاں پر مسلمانوں نے اول الذکر کے خلاف ووٹ دیا۔ جبکہ جن ریاستوں جیسے اتر پردیش، بہار اور مہاراشٹر میں سیاسی میدان متنوع نوعیت کا تھا وہاں پر مسلمانوں کا ووٹ مختلف سیاسی پارٹیوں کے درمیان تقسیم ہوتا رہا جس کی بنیاد مقامی یا طبقاتی اور اتحادی مفادات تھے۔

آسام ایک ایسی ریاست ہے جہاں نہ صرف مسلمان آبادی کا قابل ذکر تناسب میں حصہ ہیں بلکہ ریاستی اسمبلی کے کئی حلقوں میں تو مسلمان اکثریت یا برابر کی تعداد میں ہیں یا

قابل ذکر تعداد کے حامل ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آسام میں آسام یونائٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ (audf) ایک نئی اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی پارٹی بن گئی ہے۔ کیرالہ میں بھی مسلمان بھاری تعداد میں ہیں اور ان کی سیاسی موجودگی اور پارٹی مسلمہ ہے جس کا نام انڈین یونین مسلم لیگ ہے۔ اور اس ریاست میں کانگرس یا کمیونسٹ پارٹی جیسی مرکزی پارٹیوں میں سے چاہے کوئی بھی پارٹی حکومت بنائے، یہ آسام یونائٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ اس کا لازمی کا حصہ ہوتی ہے۔ دیگر موثر مسلم سیاسی پارٹیوں میں آندھرا پردیش کی مجلس اتحاد المسلمین بھی شامل ہے۔

مسلم سیاست میں ایک حالیہ قابلِ ذکر پیش رفت ہندوستان بھر میں نئی مسلمان سیاسی پارٹیوں کا پھیلاؤ ہے اگرچہ ان میں سے کئی زیادہ عرصہ نہ چل سکیں۔ سب سے زیادہ آبادی کی حامل اور سیاسی طور پر سب سے زیادہ سرگرم شمالی ہندوستان کی ریاست اتر پردیش میں نصف درجن کے قریب مسلم سیاسی پارٹیاں قیام میں آئیں۔ تاہم اس پیش رفت کی سیاسی طور پر اہمیت کیا ہے؟ یہ ابھی تک واضح نہیں ہے۔ تاہم اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان نظریاتی اور سیاسی اتفاق رائے ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہے۔ اس پیش رفت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے مشترکہ مفادات کے حوالے سے شعور میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ہندوستان کے قومی تشخص اور مسلمانوں کے تصورات اور ثقافت کے اس میں مقام کے معاملے پر زور وشور سے بحث ہونے لگی ہے۔

طویل عرصے سے قائم مسلم سیاسی پارٹیوں اور تحریکوں مجلس اتحاد المسلمین، جمعیت علمائے ہند اور آئی یو ایم ایل میں گہری تقسیم بھی ایک اہم پیش رفت ہے۔ ان تینوں پارٹیوں میں تقسیم کی وجہ پارٹیوں پر خاندانوں کے قبضے یا اجارہ داری (مجلس اتحاد المسلمین میں اویسی خاندان اور جمعیت علمائے ہند میں مدنی خاندان) کی پاداش میں جنم لینے والی ذاتی مخاصمت ہے جو مسلمان سیاسی قیادت کے نیم جاگیردارانہ مزاج کا واضح ثبوت ہے۔

MashalBooks.org

تشدد، انتہا پسندی اور ریاست

2002ء میں مغربی بھارت کی ریاست گجرات میں مسلمانوں کو ہجوم کے حملوں کی صورت میں انتہائی خوفناک اور منظّم تشدد کا سامنا کرنا پڑا جس میں لوگوں کو بھیانک طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ انہیں زندہ جلایا گیا اور جسموں کے ٹکڑے کیے گئے۔ ریپ کیا گیا اور ان کی جائدادوں، مساجد اور درگاہوں کو بڑے پیمانے پر تباہی کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ واقعات جن واقعات کے نتیجے میں پیش آئے ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا اور ان پر بحث کی جاتی رہتی ہے۔ دائیں بازو کے ہندو کارکن گودھرا میں ایک ریلوے پلیٹ فارم پر مسلمانوں کے خلاف گالم گلوچ اور تشدد کا مظاہرہ کررہے تھے جس پر اس ٹرین کو نذرِ آتش کردیا گیا جس میں وہ سوار تھے جس کے نتیجے میں ہلاکتیں اور لوگوں کے زخمی ہونے کے واقعات پیش آئے۔ اس واقعے کے بعد ہندوؤں نے شدید اشتعال میں آکر گودھرا اور دیگر علاقوں میں مسلمانوں پر وحشیانہ طریقے سے حملے شروع کردیے۔

یہ بات واضح ہے کہ ریاست اور اس کے سب سے بڑے شہر احمد آباد میں مسلمانوں کی آبادیوں پر جس طرح حملے کیے گئے وہ نہایت منظّم تھے جس میں حملہ آوروں کو اس وقت کی سیاسی پارٹی کی ریاستی حکومت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ حملہ آور ہندو مسلمانوں کی تلاش کے لیے ووٹر لسٹیں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے۔ چند مستثنیات کے علاوہ پولیس مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی بلکہ ممکنہ طور پر تشدد کی حمایت اور اس میں شرکت کرتی

MashalBooks.org

رہی۔ریاست کے وزیراعلیٰ سمیت تمام منتخب رہنماؤں نے ان واقعات کے حوالے سے کسی قسم کی معذرت اور شرم کا مظاہرہ نہیں کیا۔اس موقع پر جو کچھ ہوا اس کے بارے میں اکثر ''پوگرام'' (قتلِ عام) کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی۔

ہندوستان میں آباد مسلمان کس قدر آسان شکار ہیں؟ آزادی کے پچاس سال بعد پیش آنے والا یہ واقعہ اس کی بھرپور عکاسی کرتا تھا۔یہ ایک ایسا امر تھا جس کے بارے میں ہندوستان میں سیاسی استحکام، سماجی یک جہتی اور انسانی حقوق کے علم بردار پہلے ہی تشویش کا شکار تھے۔اس کے علاوہ ہندوستان میں اس حوالے سے بھی ایک سوچ بیدار ہوئی تھی کہ بیسویں صدی میں پیش آنے والا تشدد کا یہ واقعہ ایک نئی قسم کی اہمیت کا حامل تھا۔اس کے علاوہ یہ تشویش بھی پیدا ہوئی تھی کہ ریاستی حکام اور اداروں اور مسلم مخالف انتہا پسند تنظیموں کے درمیان جنم لینے والا یہ گٹھ جوڑ ملک میں لاء اینڈ آرڈر کے لیے ایک نئے خطرے کے طور پر سامنے آیا تھا۔

گجرات میں اس بات کے ٹھوس شواہد موجود تھے کہ ریاستی حکومت کے اعلیٰ ترین حکام بذات خود تشدد کے واقعات میں ملوث تھے۔ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس سری کمار جیسے پولیس افسر جنہوں نے کسی امتیازی سلوک کے بغیر لوگوں کے جان ومال کی حفاظت کرنے کی کوشش کی انہیں سینئر ریاستی حکا م کی جانب سے محکمانہ کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔بعدازاں سپریم کورٹ نے سری کمار کے حق اور ریاستی حکومت کی مخالفت میں فیصلہ بھی سنادیا۔ریاستی حکومت نے اس موقع پر جس طرح منظم طریقے سے جان بوجھ کر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مظاہرہ کیا اس نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کے مفادات اور فلاح کو خطرے میں ڈال دیا۔اس سے بحیثیت مجموعی ہندوستانی ریاست کی اپنے شہریوں اور وسیع تر ہندوستانی معاشرے کی معاشی ترقی کی حفاظت کے سلسلے میں کمزوری عیاں ہوگئی۔

عوامی بدامنی کے واقعات میں ریاستی اداروں کی منظم ملی بھگت کے شواہد کے علاوہ گجرات سانحہ کے نتائج سے عوامی امن وامان کو منظم طریقے سے کمزور کیے جانے کی نشاندہی ہوئی۔ہندو مسلم فسادات کے گذشتہ واقعات اب جدید ہندوستان میں بغاوت کی شکل اختیار کرگئے ہیں جس میں ہجوم جوابی انتقامی کارروائی کرتا دکھائی دیتا ہے۔اس کے برعکس

27مارچ کا ''ٹائمز آف انڈیا'' اپنی رپورٹ میں کہتا ہے کہ گودھرا کے ابتدائی واقعے کے پورے ایک ماہ بعد گجرات کے تیس سے زائد شہر اور قصبے کرفیو کی حالت میں تھے۔ ہندوستان میں مذہبی فسادات کی ایک لگی بندھی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں مقامی نوعیت کا تشدد ہوتا ہے یا چند محلوں یا علاقوں میں تشدد کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں گجرات میں یہ تشدد بری طرح پھیل گیا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں 53 ریاستی انتخابی حلقے 993 دیہات 183 قصبے اور 284 پولیس سٹیشن متاثر ہوئے۔

تشدد اور بلوے کے جوابی اقدامات کے نتیجے میں ہلاکتوں کا تناسب ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کے کم تناسب کی وجہ سے ہمیشہ غیر متوازن رہتا ہے۔ تاہم سانحہ گجرات میں یہ تناسب خطرناک حد تک پہنچ گیا۔ گودھرا میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی اموات کا تناسب 1.5 تھا یعنی ایک ہندو کے مقابلے میں پانچ مسلمانوں کو مارا گیا جبکہ گودھرا واقعے کے مزید نتائج میں یہ تناسب 1.15 تک پہنچ گیا یعنی ایک ہندو کے مقابلے میں پندرہ مسلمانوں کو ہلاک کیا گیا۔ مسلمانوں کو نشانہ بنائے جانے کے سلسلے میں جو دو نئے نمونے سامنے آئے اس سے رجحان میں تبدیلی کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جن علاقوں میں مسلمان غالب اکثریت میں ہوتے ہیں وہاں پر وہ مقابلتاً محفوظ ہوتے ہیں تاہم گجرات کے واقعے میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں پر حملے کیے گئے جبکہ گجرات کے دیہاتی علاقوں میں جس طرح تشدد اور ہلاکتیں پھیلتی چلی گئیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

سانحہ گودھرا کے دو ماہ بعد کیمپوں میں مقیم بے گھر مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے مستقل گھر حاصل کر چکے ہیں تاہم کم ہی لوگ دوبارہ اپنے اصل گھر کو لوٹ سکے۔ سانحہ کے نتیجے میں جو طویل المیعاد رجحان دیکھنے میں آیا وہ رہائش کے مقابلے میں شدید نوعیت کی علیحدگی (segregation) تھی حتیٰ کہ جو خوشحال مسلمان خاندان اس سے پہلے ملی جلی آبادیوں میں رہتے تھے وہ بھی غالب اکثریت والے مسلمان محلوں آبادیوں میں چلے گئے۔ محلے بستیاں الگ کرنے کے اس رویے کے نتیجے میں ان غریب مسلمان آبادیوں کے مسائل اور بھی بڑھ گئے جہاں پر رہائشی سہولیات پہلے ہی بہت کم تھیں۔

بہت سے مسلمان اور غیر مسلم ہندوستانیوں نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ مرکزی ہندوستانی

MashalBooks.org

رائے عامہ اور مسلم رائے کے درمیان نفسیاتی اور ثقافتی خلیج میں اضافہ بڑھ رہا ہے۔ یہ خلیج آبادی کے دونوں طبقات کی ایک دوسرے کے بارے میں رائے اور تاثر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس میں وہ ایک دوسرے کے بارے میں شبے کا شکار ہیں اور ایک دوسرے سے مخاصمانہ رویہ رکھتے ہیں۔ایک سمجھتا ہے کہ دوسرا مشترکہ قومی شناخت کی بنیاد پر قائم قومی وحدت کے ساتھ پوری طرح مخلص نہیں۔ ان میں ایک دوسرے کی ثقافت اور طور طریقوں کے حوالے سے افسانوی قسم کا تعصب پایا جاتا ہے۔اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ گودھرا واقعے کے بعد گجراتی اخبارات اور ذرائع ابلاغ کا رویہ مسلمانوں کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نوعیت کا تھا حتیٰ کہ اس میں قارئین کو مسلمانوں کے خلاف تشد د کے لیے بھڑکایا جاتا تھا۔

ہندوتوا کے علمبردار عام طور پر مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں دہشت گردی کے واقعات ہورہے ہیں اور مبینہ طور مسلمان ان دہشت گردوں سے ہمدردی رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان کی مدد بھی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا ایک بااثر مدرسہ دیوبند2007 اور2008 میں دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے اسے انسانیت کے خلاف بھیانک جرم قرار دے چکا ہے۔ اس بیان کے نتیجے میں مسلمانوں کے اس قدیم ترین مذہبی مدرسے کی عزت و احترام میں بہت اضافہ ہوا۔مئی 2008ء میں مدرسہ دیوبند نے ایک فتویٰ جاری کیا جس میں دہشت گردی کو غیر اسلامی قرار دیا گیا۔2009ء میں دارالعلوم دیوبند نے خودکش دھماکوں کو بھی غیر اسلامی قرار دے دیا۔اس کے نتیجے مسلمان انتہا پسند غضب ناک ہوگئے۔2008ء میں جے پور کے بمباروں نے ایک بیان جاری کیا جس میں انہوں نے دیوبند کے علماء کو ننگی گالیاں دیں اور انہیں بزدلوں کا ٹولہ اور ہندوازم کے پتلے قرار دیا۔ایک مسلم رکن پارلیمنٹ نے لکھا کہ ہندو مسلمانوں پر اس لیے حملے کررہے ہیں کہ وہ دہشت گردوں کی مدد کررہے ہیں اور دہشت گرد مسلمانوں پر اس لیے حملے کررہے ہیں کہ وہ دہشت گردوں کی مدد نہیں کررہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگرچہ کوئی بھی شخص مسلمان ہندوستانیوں کے خلاف انتہا پسند ہندوؤں کے نظریات کا جواز نہیں پیش کرتا تاہم کچھ مشکلات بدستور موجود ہیں۔ یہ مشکلات دو چیزوں سے جنم لیتی ہیں جن میں ایک الہیاتی اور دوسری عملی ہے۔مثال کے

طور پر ممتاز لبرل مسلمان بشمول سابق یونین منسٹر عارف محمود خان کا کہنا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے دہشت گردوں کی مذمت میں جاری کیا جانے والا بیان تو موجود ہے لیکن ساتھ ہی اس مدرسے میں پڑھایا جانے والا سبق بھی موجود ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ ''کافروں کے لیے تلوار کی تباہی آ کر رہے گی چاہے وہ پہلے حملہ نہ بھی کریں۔''اور یہ سبق مسلمانوں کی کئی مقدس کتابوں کی بنیاد پر پڑھایا جاتا ہے۔مزید براں ہندوستانی مسلمان دہشت گردی کے کئی واقعات اور منصوبوں میں بھی ملوث پائے گئے ہیں۔

MashalBooks.org

ریاست اور معاشرہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت مشکوک ہے۔ایک جانب تو ہندوستان میں ایک ایسا نظام منظم اور سرکاری آشیر باد کے ساتھ سامنے آرہا ہے جس میں مسلمانوں کو امتیاز کا نشانہ بنایا جارہاہے اور دوسری جانب گذشتہ دو سے بھی کم عشروں کے دوران ہندو دائیں بازو کی جماعتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے جن میں بی جے پی تو قومی اور ریاستی سطح پر اقتدار کی مالک بھی رہ چکی ہے اور اس کا ایسی جماعتوں کے ساتھ قریبی نظریاتی اور سیاسی اتحاد رہا ہے جو مسلم مخالف اور انتہا پسند ہیں جن میں راشٹریہ سیوک سنگھ (آرایس ایس)، وشوا ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی جماعتیں شامل ہیں۔حکومتی طاقت کی جانب سے تعلیمی نصاب کا کنٹرول بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا گیا اور پبلک سروسز میں جان بوجھ کر نظریاتی ہندو انتہا پسندوں کو شامل کرنے کے مواقع پیدا کیے گئے۔

تیزی سے ہونے والی ان پیش رفتوں کے نتیجے میں ثقافتی مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ان مباحث کا ایک منبع تو ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے تجربات اور رائے کو سمجھنے سے قاصر ہونا ہے اور دوسرا مسلمانوں کے بارے میں پیدا ہونے والا یہ عالمی تاثر ہے کہ غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کی اصل وفاداری اپنے پان اسلامی تشخص کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور وہ یہ سب کچھ قومی وفاداری کی قیمت پر کرتے ہیں۔اور تیسرا روزمرہ زندگی میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تیزی سے بڑھتی ہوئی خلیج ہے۔

ہندوستانی تاریخی سکالر شپ سے متعلق ایک بااثر تنظیم کے مطابق ہندو شاونزم کا زیریں بہاؤ (undercurren) یا کم ازکم ہندو برتری کا رویہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اسے

MashalBooks.org

بی جے پی اور اس کے ہندتوا کے علمبردار اتحادیوں کے حالیہ دنوں میں منظر عام پر آنے سے پہلے کے تناظر میں دیکھا جائے۔ اور یہ کہ یہ رویہ بظاہر سیکولر انڈین نیشنل کانگرس میں بھی طویل عرصے سے موجود ہے۔ تاہم بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ کانگرس پارٹی جس طرح گذشتہ دوعشروں کے دوران موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے ہندوستان میں بالعموم اور گجرات میں بالخصوص ''سافٹ ہندتوا'' کی بات کرنے لگی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کانگرس میں یہ رویہ اس سے بھی زیادہ پرانا ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستانی سماج کے متوازن اور بااثر رجحانات ہندوستان کے سیاسی طرز حیات کی سیکولر روایات اور ہندوستانی آئین وقانون کی سیکولر ضروریات پر زور دیتے ہیں اور مسلم کلچر اور تاریخ کو اپنا لازمی حصہ سمجھتے ہوئے قومی شناخت کے ملے جلے تصور کو اپیل کرتے ہیں۔ یہ روایات ایک ایسے سماج جہاں مسلمان بھاری تعداد میں آباد ہیں اور غیر مسلموں کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں، اس کے سماجی امن اور سیاسی استحکام کی وسیع تر ضروریات کو بھی اپیل کرتی ہیں۔

بہت سے حلقے ''ٹوکن ازم'' یعنی ووٹ بینک کی سیاست کا الزام لگاتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو رعایات دی جاتی ہیں، وہ ان کے مفادات کے بجائے ان کے ووٹ بینک کو مدنظر رکھ کر دی جاتی ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ سچائی بھی ہے اور اکثر مسلمانوں کے جن مفادات کو پورا کیا جاتا ہے ان کا تعلق ان کی ثقافتی شناخت سے ہوتا ہے جیسا کہ شادی اور وراثت کے لیے علیحدہ مسلم قوانین وغیرہ، جن کی بنیاد ایک مشترکہ قومی تشخص کے بجائے ان کی منفرد حیثیت پر مبنی ہوتی ہے۔ دوسری جانب سیاسی اشرافیہ مسلم تشخص اور شناخت کے حوالے سے ایک مخصوص قسم کی رائے رکھتی ہے جس کی بنیاد اصلاحات کے حامی مسلمانوں، مسلم خواتین کے حقوق کے علم برداروں اور دیگر لبرل حلقوں کے متنوع مفادات کے بجائے قدامت پرست مسلم مذہبی لیڈروں کے خیالات اور مطالبات پر ہوتی ہے۔ یہ تاثر کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں، کئی ہندوؤں میں ناراضگی اور نفرت کو جنم دیتا ہے اور پھر اس چیز کو انٹی مسلم تحریکیں اور نظریات کے حامل ہندو گروہ استعمال کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

ان سب باتوں سے قطع نظر ہندوستانی سیاست اور سیاسی عمل کاری میں اب اس بات کو اہمیت دی جانے لگی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی مسائل اور ایشوز پر توجہ دی جائے۔اس سوچ کا عملی مظاہرہ اس طرح ہورہا ہے کہ بھارت میں سرکار کی سطح پر اب بار بار ایسی کوششیں کی جارہی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کی سلامتی اور فلاح و بہبود کے حوالے سے جائزہ رپورٹ تیار کرنا ہے۔1952ء کے کمیشن آف انکوائری ایکٹ اور وزیراعظم کی جانب سے جاری کردہ نوٹیفکیشن کے ساتھ احکامات جاری کیے جاچکے ہیں کہ اس بارے میں رپورٹیں تیار کی جائیں۔متعدد تجزیہ نگار اور مشاہدہ کار اس قسم کی تحقیقاتی باڈیز کو محض دکھاوے کی کارروائیاں قرار دیتے رہے ہیں۔تاہم ان تمام تجزیات کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ حکومت اس قسم کی انکوائریز اور رپورٹس کی اہمیت کو محسوس کرنے لگی ہے اور اس سلسلے میں وسائل بھی صرف کرچکی ہے(بعض کیسوں میں قابل ذکر سیاسی توجہ بھی دی گئی)۔اس سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ اب ان ایشوز کی اہمیت کو تسلیم کیا جارہا ہے اور ہندوستانی حکومتی نظام میں مسلم مفادات کی جانب توجہ دی جانے لگی ہے۔

اس سلسلے میں ایک مضبوط ترین مثال وزیراعظم کی جانب سے جسٹس راجندر سچر کی سربراہی میں اعلیٰ سطحی کمیٹی کا قیام ہے جس کی ذمہ داری مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی حالت کے حوالے سے رپورٹ کی تیاری تھا۔2006ء میں سچر کمیٹی نے رپورٹ دی جو کہ ایک جامع جائزہ کی صورت میں تھی جسے فیلڈ ورک، اعداد وشمار، لٹریچر اور سماعتوں کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔1983ء میں گوپال سنگھ انکوائری رپورٹ میں پہلے ہی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی نشاندہی کی جاچکی تھی جن میں ان میں پرائمری سکولوں سے سب سے زیادہ اخراج کے تناسب اور ہائیر اور ٹیکنیکل ایجوکیشن میں کم ترین تناسب کی نشاندہی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی شرح سکھوں اور عیسائیوں سے بھی کم تھی۔

2007ء میں نیشنل کمیشن فار ریلیجئس اینڈ لنگوسٹک مائنوریٹیز المعروف مشرا کمیشن بھی اپنی رپورٹ میں سچر کمیشن جیسے ہی نتائج پر پہنچا جس کے مطابق مسلمانوں کے لیے تعلیمی اور ملازمتی مواقع ان کی آبادی کے تناسب سے بہت کم پائے گئے تھے۔تاہم مشرا کمیشن کے حوالے سے سیاسی اور سماجی تجزیہ کاروں کی بنیادی دلچسپی اسی اہم سوال کے بارے میں تھی جو سچر کمیشن کی رپورٹ کے ضمن میں سامنے آیا تھا: آیا کاسٹ سسٹم (ذات پات کا نظام) کے

متاثرین کے لیے جو اقدامات ہندو، سکھوں، بدھوں اور قبائلی لوگوں کے لیے ہیں، ان کا دائرہ کار نچلی ذات کے عیسائیوں اور مسلمانوں تک وسیع کردیا جائے۔عیسائیوں اور مسلمانوں کے حقوق کے متعدد علم برداروں کا کہنا تھا کہ ایسا کرنا مناسب ہوگا کیونکہ ہندوستان کا مخصوص کاسٹ سسٹم (ذات پات کا نظام)ان مذہبی گروہوں میں مکمل طور پر ختم نہیں ہوا اور نچلی ذات کے جو ہندو مسلمان اور عیسائی ہوگئے تھے وہ ذات پات کے نظام سے بدستور متاثر ہیں۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے درمیان ذات پات کے نظام کی موجودگی کوئی راز کی بات نہیں جس کے تحت مذہب تبدیل کرنے والے نچلی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ اور قسم کا سلوک ہوتا ہے اور وسط ایشیائی ماخذ رکھنے والے خاندانوں کے ساتھ سلوک اور قسم کا ہوتا ہے۔

1998ء میں سری کرشنا کمیشن نے ممبئی سٹاک ایکسچینج پر بم حملوں کے بعد ممبئی میں دسمبر 1992ء اور جنوری1993ء میں ہونے والے مسلم کش فسادات کے بارے میں رپورٹ دی تھی۔ اس رپورٹ میں اس تاثر کو مسترد کیا گیا تھا کہ یہ فسادات ہندوؤں کے فوری ردعمل کا نتیجہ تھے اور قرار دیا تھا کہ یہ فسادات اخبارات اور جرائد اور مقامی دائیں بازو کی پارٹی شیوسینا کے رہنماؤں نے جان بوجھ کر بھڑکائے تھے اور ان کو جواز فراہم کیا تھا جبکہ ریاستی حکومت نے فسادات میں ملوث لوگوں کی مدد کی تھی یا وہ خاموش تماشائی بنی رہی تھی۔ایک عشرے بعد گجرات میں ہونے والے فسادات کے حوالے سے کمیشن نے رپورٹ میں انکشاف کیا تھا کہ ان فسادات میں مسلمانوں پر فوجی مہارت کے ساتھ حملے کیے گئے جبکہ حملہ آوروں نے ووٹر لسٹیں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھیں۔

جیسا کہ بعدازاں گجرات میں ہوا جسٹس سری کرشنا رپورٹ کے مطابق ممبئی میں پولیس اہلکاروں نے انفرادی طور پر مسلمانوں کے خلاف حملوں میں حصہ لیا اور اس بات کے شواہد بھی ملے کہ پولیس فورس میں مسلمانوں کے خلاف تعصب تھا جس نے مسلمانوں پر حملوں، لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات کی روک تھام کے لیے کوئی ٹھوس کارروائی کرنے سے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

اس رپورٹ سے واضح طور پر اس بات کی عکاسی ہوتی تھی کہ ممبئی میں1992-93ء کے فسادات میں ریاستی اداروں اور ہندوستانی سماج کی جانب سے مسلمانوں کے تحفظات کا موثر

طریقے اور صلاحیت کے ساتھ جواب دیا گیا۔پولیس کے علاوہ مسلم اور سیکولر کمیونٹی آرگنائزیشن کی جانب سے نہایت کامیاب محلّہ کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اعتماد سازی، مشاورت اور ریاست اور سماج کے درمیان باہمی تعاون کا فروغ تھا۔ان کمیٹیوں میں خاصے سینئر ریٹائرڈ پولیس افسروں کے علاوہ محلے کے سرگرم کارکن شامل تھے جو پولیس کو محلے میں ہر قسم کی پیش رفت سے باخبر رکھتے تھے اور محلّہ بھی پولیسنگ کی ہر قسم کی ضروریات سے آگاہ رہتا تھا۔ حالانکہ گذشہ چند سال کے دوران ممبئ میں دہشت گردی کے دو بڑے واقعات رونما ہو چکے تھے لیکن یہ کمیٹیاں ہر قسم کے تشدد کے واقعات کی روک تھام میں فخر محسوس کرتی تھیں۔

تازہ ترین رپورٹ (2009ء) جسٹس لبرہان کمیشن نے پیش کی جس کا مقصد1992ء میں اتر پردیش کے شہر ایودھیا میں ایک ہندو مجمعے کی جانب سے بابری مسجد کو گرائے جانے کے واقعے کی تحقیقات تھا۔دلچسپ امر یہ ہے کہ لبرہان کمیشن کو اپنی رپورٹ تین ماہ کے اندر پیش کرنے کی ہدایت تھی لیکن یہ کمیشن بابری مسجد کی شہادت کے حوالے سے سترہ سال بعد اپنی رپورٹ مکمل کرسکا جبکہ اس کی تحریری رپورٹ تیار کرنے میں مزید کئی سال لگادیے گئے۔ پھر حکومت نے یہ رپورٹ عوام کے لیے جاری کرنے میں کئی ماہ صرف کردیے۔اس تمام تاخیر کی وجہ سے کمیشن اور حکومت دونوں کو شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

سری کرشنا اور لبرہان کمیشنوں کی رپورٹ میں کچھ چیزیں ایسی تھیں جو مسلمانوں کے وکلاء کے لیے اشتعال کا باعث تھیں۔مثال کے طور پر ان دونوں رپورٹوں میں یہ بات تسلیم کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے خلاف تشدد اچانک ردعمل کے بجائے سوچا سمجھا تھا اور یہ کہ دائیں بازو کے ہندو انتہاپسند گروپ باقاعدہ سرکردہ سیاسی رہنماؤں کی آشیر باد اور ریاستی حکام اور وپولیس کی ملی بھگت کے ساتھ سب کچھ کررہے تھے تاہم ان کے ساتھ مسلمانوں کے وہ فرقہ ورانہ اور جرائم پیشہ عناصر بھی اس کے ذمہ دار تھے جو ان فسادات میں شامل ہوگئے تھے اور اس مسئلے کو زیادہ پیچیدہ بنانے کا باعث بنے تھے۔اس کے جواب میں مسلمانوں اور سیکولر

MashalBooks.org

ہندو رائے عامہ کا کہنا تھا کہ اس قسم کی تحقیقات بدقسمتی سے اس نمونے کی عکاسی کرتی ہیں جس میں متاثرین کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔

سانحہ گجرات کا باعث بننے والے گودھرا ٹرین واقعے کے حوالے سے ستمبر2008ء میں رپورٹ دینے والے نانا وتی، مہتا (پہلے نانا وتی، شاہ کمیشن) عدالتی کمیشن پر بھی اسی قسم کے الزامات عائد کیے گئے۔اس کمیشن کے اصل چیئرز نے اپنے ریمارکس میں کہا تھا کہ وہ اپنے ذہن تحقیقات سے پہلے ہی بنا چکے تھے۔مسلمانوں کی جانب سے جان بوجھ کر اور نظریاتی طور پر ٹرین کو حملے کا نشانہ بنانے کے حوالے سے انہوں نے جن تحقیقاتی شواہد پر انحصار کیا تھا، وہ شدید متنازعہ تھے۔واقعے کے موقع پر گجرات پولیس کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل جو اس حوالے سے بہت ذمہ دار اور واقعات کے بارے میں بہت زیادہ جانکاری رکھنے والے تھے، نے نانا وتی کمیشن کے روبرو اپنی شہادت میں کہا تھا کہ سرکردہ سیاسی قیادت نے اسے سچ بولنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی ہیں تاہم نانا وتی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس کا کوئی ذکر نہ کیا۔پھر اس واقعے کے حوالے سے گذشتہ انکوائری، جو انڈین ریلوے ایکٹ کے تحت جسٹس بینر جی کی سربراہی میں تشکیل دی گئی تھی، کے بالکل متضاد نتائج کے بارے میں بھی اس کمیشن نے کسی قسم کی سرزنش کا اظہار نہیں کیا۔

MashalBooks.org

سماجی اور معاشی نقصانات

گذشتہ عشروں کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کو معاشی، سماجی اور ثقافتی طور پر مارجنلائزیشن کا سامنا ہے۔سوائے چند مستثنیات کے ہندوستانی مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ غربت اور تعلیم کی کمی کا شکار ہیں اور سماجی طور پر ان سہولتوں سے بھی محروم ہیں جو غریب ترین لوگوں کو بھی حاصل ہوتی ہیں۔عمومی رویوں میں بھی انہیں شدید تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔پولیس اور حکام بھی ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ تعلیمی نصاب میں انہیں امتیاز کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور ثقافتی طور پر بھی وہ منفی سلوک کے مستحق قرار پاتے ہیں۔اگرچہ انہیں متعدد مرتبہ پاکستان کے ہمدرد سمجھتے ہوئے عوامی رویوں میں تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے تاہم بیشتر اوقات ہندوستانی مسلمان ملک کے لیے محبّ وطن اور وفادار ہوتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کے حالیہ خراب حالات کی ایک وجہ تیزی سے رونما ہونے والی معاشی اور سماجی تبدیلیاں بھی ہیں جو کہ جدت اور گلوبلائزیشن پوری دنیا میں لے کر آئی ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کے روایتی روزگار کے ذرائع تباہ ہو چکے ہیں۔ کچھ وجہ ہندوؤں میں جنم لینے والا ثقافتی قوم پرستی کا ارتقائی رجحان ہے۔یہاں کے مسلمانوں، ان کے ہندو اتحادیوں اور ہمدردوں میں بڑے پیمانے پر یہ سوچ پیدا ہوئی ہے کہ قومی تشخص کی ہندووانہ طرز فکر کی تیاری کے ضمن میں ہندوستانی فکر اور ثقافت کو تشکیل دینے میں مسلمانوں اور اسلام کے اہم کردار کو جان بوجھ کر فراموش کیا جا رہا ہے۔

اگرچہ ہندوستانی سماج میں مسلمانوں کی حیثیت کی منظّم اور ثقافتی حد بندی کرنے والے عناصر کی جانب توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے تاہم اس کے ساتھ یہ بھی اہم ہے کہ مسلمانوں کی خراب حالت کو اس سماجی اور معاشی نقصانات کے وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے

MashalBooks.org

جس سے ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ کئی دیگر سماجی گروہ بھی متاثر ہیں۔

حالیہ سالوں کے دوران ہندوستان کی مجموعی متاثر کن معاشی شرح نمو، اسکے سرمائے کی غیر ملکی اثاثوں کے حصول کی تلاش اور نالج بیسڈ انڈسٹریز میں اس کی مسابقانہ کارکردگی کے باجود ہندوستان کم ترین فی کس آمدنی والا ملک ہے جسے عدم مساوات جیسے سنگین مسئلے کا سامنا ہے اور جہاں غذائی قلت اور بچوں کی شرح اموات سب صحارن افریقہ کی سطح پر ہے اور سماجی نظم وضبط اور شہری امن کو شدید خطرات لاحق ہیں۔عدالتوں تک غریب افراد کی نامناسب رسائی، پولیس کی ناقص کارکردگی، سزاسنائے جانے سے پہلے طویل عرصے تک حراست اور جیلوں کی خراب حالت ہندوستان کے تمام غریبوں کا مسئلہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے لیے یہ مسائل زیادہ شدید ہیں۔تاہم ہندوستان کے مسلم اور غیر مسلموں کے مشترکہ مسائل کا جائزہ لینے سے ہمیں مسلمانوں میں موجود زیادہ غربت اوران کے ساتھ ایک منظم مسلم مخالف امتیاز کے بارے میں ایک واضح فہم تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے دوران آبادی کے تبادلے کے موقع پر مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت میں ہندوستان کے بہترین پڑھے لکھے اور معاشی طور پر خوشحال لوگوں کی بڑی پیمانے پر ہجرت کی وجہ سے ہندوستان میں جو مسلمان آبادی باقی رہ گئی وہ مقابلتًا کم پڑھی لکھی اور غریب تھی۔ہندوستانی مسلمان اپنے گھروں سے زیادہ دور کام کرنے کے حوالے سے پراعتماد نہیں تھے اوران کا روایتی روز گار اس قسم کا تھا جو انہیں ایک مخصوص علاقے میں ہی رکھتا تھا۔اس میں ہندوستان بھر میں پائے جانے والے پیشے جیسے چمڑے کے سامان کا کاروبار اور راجھستان، گجرات، مہاراشٹر اور مغربی بنگال میں تھوک و پرچون کی تجارت وغیرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخصوص علاقوں کے مخصوص پیشے جیسے مبارک پور، گورکھ پور اور بنارس کے جولاہے اور علی گڑھ کے تالہ ساز شامل تھے۔یہ روایتی پیشے مسلمانوں کو ان کی نہ صرف معاشی ضروریات کی اچھی بنیاد فراہم کرتے تھے بلکہ اس میں ہی ان کے لیے آگے بڑھنے کے بھی مواقع ہوتے تھے۔ جدید تعلیم کی آمد کے بعد وہ ان پیشوں میں مزید آگے نہ بڑھ سکے کیونکہ ان پیشوں میں اکثر اپنے بچوں پر ہی انحصار کیا جاتا تھا۔دوسری جانب تعلیم حاصل کی جاتی تو وہ زیادہ تر روایتی مذہبی تعلیم ہوتی تھی۔حالیہ معاشی رجحانات سے کچھ پیشوں کو فائدہ ہوا جیسے تاجر اور چمڑے کا کاروبار کرنے والے گروہ وغیرہ جبکہ درآمد شدہ

سامان آنے سے روایتی ہینڈی کرافٹ کا کام زوال پذیر ہوگیا۔

تقسیم کے نتیجے میں مسلمانوں کی سماجی ساخت میں آنے والی شفٹ نے1950-60 کے عشروں کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی قیادت کو بھی تبدیل کردیا۔ ہندوستان کی سیکولر مسلم قائدین کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا مسلمانوں کی مرکزی قیادت واضح طور مذہبی قیادت یا روایتی قسم کے عناصر میں تبدیل ہوگئی۔ان لوگوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفادات کے بجائے محض ان کی مسلم شناخت پر زور دینا شروع کردیا۔

مختلف شعبوں میں مسلمانوں کی ان کی آبادی کے اعتبار سے کم ترین نمائندگی خاص طور پر اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ وہ نقصان سے دوچار ہیں چاہے اس کی وجوہات سماجی معاشی ہوں یا یہ مسلم مخالف امتیازی رویہ ہو۔سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق جیلوں میں مسلمانوں کی تعداد قابلِ ذکر حد تک زیادہ ہے۔مغربی ریاست مہاراشٹر میں مسلم آبادی کا تناسب دس فیصد سے بھی کم ہے لیکن وہاں پر جیلوں میں بند اور مقدمات کا سامنا کرنے والے مسلمانوں کا تناسب کل تناسب کا ایک تہائی ہے۔ ہندوستان کی انتظامی سروس میں پبلک سروس کے اعلیٰ ترین افسروں میں مسلمانوں کا تناسب صرف تین فیصد ہے جبکہ ان کی ہندوستان میں کل آبادی کا تناسب13.5 فیصد ہے۔ پندرہ ریاستوں کے ایک سروے کے مطابق مسلمان ڈسٹرکٹ ججوں کا تناسب بھی تین فیصد ہے۔ ہندوستانی پولیس سروس کی بات کی جائے تو اس میں مسلمانوں کا تناسب تھوڑا سا بہتر ہے جو کہ مرکزی سطح پر بھرتی کیے جانے والے اعلیٰ آفیسر کیڈر کے حوالے سے ہندوستان بھر میں چار فیصد ہے۔ ہائیکورٹ کے جج بھی چار فیصد اور جوڈیشل آفیسر چھ فیصد ہیں۔ تاہم ان کی آبادی کے تناسب سے یہ پھر بھی کم ہے۔

قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی ایسی ریاستوں (آسام، مغربی بنگال، کیرالہ، اترپردیش، بہار)میں بھی کم ہے جہاں وہ ایک قابلِ ذکر اقلیت کے طور پر زیادہ ثقافتی اور سیاسی اثرورسوخ رکھتے ہیں اور ایسی ریاستوں(کیرالہ، مغربی بنگال، تامل ناڈو) میں بھی جہاں بہت ترقی پسند اور شراکت پسند سیاسی اور حکومتی روایات موجود ہیں۔ زیرِنظر باکس میں ان ریاستوں میں مسلمانوں کی آبادی اور پولیس فورس میں ان کی شرح سے بخوبی

صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مغربی بنگال ---- مسلمان آبادی25فیصد، پولیس فورس میں تناسب7.32

آسام ---- مسلمان آبادی30.92 فیصد، پولیس فورس میں تناسب10.95

بہار ---- مسلمان آبادی16.53 فیصد، پولیس فورس میں تناسب5.94 فیصد

کیرالہ ---- مسلمان آبادی24.70 فیصد، پولیس فورس میں تناسب12.96 فیصد

اتر پردیش ---- مسلمان آبادی18.50 فیصد، پولیس فورس میں تناسب4.24 فیصد

تامل ناڈو ---- مسلمان آبادی5.56فیصد، پولیس فورس میں تناسب0.11 فیصد

قانون کی حکمرانی، ذاتی تحفظ اور فیلڈ ورک کے دوران رپورٹ ہونے والے ریاست کی جانب سے نشانہ بنائے جانے کے احساس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اعدادوشمار خاص طور پر اہم ہیں۔

مسلح افواج کی بھی یہی کہانی ہے تاہم اس کی ایک منفرد نوعیت کی اہمیت ہے۔ مسلح افواج میں مسلمانوں کی شمولیت کا سوال بھی ہندو اکثریت کے اس تاثر کو متاثر کرتا ہے جو وہ مسلمانوں کی حب الوطنی کے بارے میں رکھتے ہیں، قطع نظر اس بات کہ مسلح افواج میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کی اصل وجوہات کیا ہیں۔ مسلمان بھی اس حوالے سے تشویش رکھتے ہیں کہ مسلح افواج میں مسلمانوں کی کم نمائندگی قوم کے ان کی حب الوطنی پر عدم اعتماد کی عکاسی کرتی ہے۔

تقسیم کے وقت مسلمان ہندوستانی مسلح فوج کا ایک تہائی تھے۔ ہندوستانی فوج کی تقسیم اور اکثر مسلمان افسروں کی جانب سے پاکستانی فوج میں شمولیت کے فیصلے سے یہ صورتحال تبدیل ہوگئی۔ گذشتہ چھ عشرے گذرنے کے باوجود ہندوستانی افواج میں مسلمانوں کے تناسب میں بہت کم بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔ اس وقت ہندوستانی افواج میں ان کی موجودگی کا تناسب صرف تین فیصد ہے۔

پبلک سروس کی ملازمتوں میں بھی مسلمانو ں کے انتہائی کم تناسب کے باعث حالیہ

برسوں کے دوران اس مطالبے کو فروغ ملا ہے کہ ان کے لیے کوٹہ مختص کیا جائے یا بہتری کے لیے کوشش کی جائے جو اس وقت حقیقت میں صرف دلتوں اور نام نہاد ''دیگر پسماندہ طبقات'' (other backward classes) کو حاصل ہے۔ لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں کو اس بنیاد پر یہ سہولت نہیں دی جاتی کہ ان کے مذہب میں ذات پات کا نظام موجود ہی نہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا کہ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے کیونکہ بعض مسلمان آخر الذکر دلیل سے متفق ہیں۔ دوسروں کا ماننا ہے کہ مسلمانوں کو اس قسم کے گروہ میں تقسیم کر کے کوئی فائدہ نہیں ملنا چاہیے۔ تاہم دوسری جانب ایک یہ احساس بھی بڑھ رہا ہے کہ وہ مسلمان جن کی حالت ویسی ہی ہے جیسی نچلی ذات کے ہندوؤں کی ہوتی ہے، ان کو کوٹہ ملنا چاہیے۔

مختلف نوعیت کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کے حوالے سے ایک بالکل منفرد قسم کی بات سرکاری طور پر فنڈ یافتہ انفراسٹرکچر اور ریاستی سروسز کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ اس بات کی نشاندہی سچر کمیٹی کی رپورٹ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ مشترکہ چائلڈ ڈویلپمنٹ سروسز تک مسلمان بچوں کی رسائی تناسب کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ 2001ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ایسے اضلاع کی تعداد گیارہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اڑتیس اضلاع میں مسلمان کل آبادی کا کم از کم پچیس فیصد ہیں۔ یہ مسلمانوں کی ہندوستان میں کل آبادی کا بھی اڑتیس فیصد بنتے ہیں۔ 182 اضلاع میں مسلمان آبادی کا دس فیصد سے زیادہ ہیں اور یہ کل مسلم آبادی کا 47 فیصد ہیں۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹے بڑے قصبے ہیں جہاں مسلمان قابلِ ذکر تعداد میں آباد ہیں۔ ان تمام علاقوں میں شہری انفراسٹرکچر اور دیگر سہولتوں کی صورتحال نسبتاً ناگفتہ بہ ہے۔ بعض تجزیہ نگاروں کا تو یہ کہنا ہے کہ مسلم ہندوستانیوں کو پبلک انفراسٹرکچر کی فراہمی کی صورت حال نظرانداز شدہ ان ہندوستانیوں جیسی ہے جو قبائلی کہلاتے ہیں۔

MashalBooks.org

تعلیم، تشخص اور اختیار

ہندوستان کی جدید مسلم تاریخ میں تعلیم، تشخص اور اختیار کے درمیان تعلق بہت الجھا ہوا رہا ہے۔ پاکستان کی تحریک اوراس سے پہلے سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک ہندوستان میں ایک منفرد مسلم تشخص کے لیے تھی جسے جدت پسندی کے علمبردار چلا رہے تھے جنہوں نے جدید تعلیم اور مغربی علم و دانش کو اپنانے کی راہ اختیار کی تھی۔تاہم یہ جدت پسند ایک منفرد مسلم شناخت کو بھی دوبارہ سے ظہور میں لانا چاہتے تھے۔

سرسید احمد خان کی جانب سے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے قیام اور مولانا محمد قاسم کی جانب سے روایتی لیکن اصلاح پسند دارالعلوم دیوبند مدرسے کے قیام کے درمیان قریبی تعلق تھا۔ یہ دارالعلوم دیوبند برصغیر میں مسلمانوں کے دو اہم ترین مکاتب فکر میں سے تھا۔ ان دونوں کا ماخذ برطانوی سربراہی اور مغلوں کی سپانسرشپ کے ساتھ قائم ادارہ دہلی کالج تھا جو1825ء میں قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ مسلمان اشرافیہ تو جدید غیر مذہبی تعلیم سے خود کو لیس کرنے لگی جبکہ دوسری جانب مدرسے اور مکاتب قائم کیے گئے جو غریب خاندانوں کے لڑکوں کو قدامت پرست اور روایتی مذہبی اقدار اور تشخص پر مبنی مذہبی تعلیم فراہم کرنے لگے اوراس کے نتیجے میں دونوں قسم کی تعلیمی فکر کے درمیان ایک ایسا اتحاد بن گیا جس کا مقصد مسلمانوں کی ممتاز جداگانہ شناخت کا تحفظ اورفروغ تھا۔

معاشی مواقع کے لیے تعلیم پر مساوی طور پر زور نہ دینے کے باعث غریب طلباء کے لیے مذہبی شناخت اور اقدار جدید تعلیم کے ذریعے معاشی میدان میں آگے بڑھنے میں رکاوٹ بن گئی۔ جدید تعلیم سے آراستہ مسلمانوں کی پاکستان ہجرت یا ہندوستان کی بالائی مڈل کلاس کے ساتھ مدغم ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی شناخت کے روایتی ذرائع جیسے مسلم فیملی لاء وغیرہ مسلمانوں کے مفادات کی بڑی علامت بن گئے اور مذہبی قائدین اور

معلمین مسلم شناخت کے علم بردار بن گئے۔

ہندوستانی آئین کے تحت مسلمانوں کو سرکاری فنڈ سے دستیاب معیاری تعلیم تک رسائی حاصل ہے تاہم عملی طور پر دیگر غریب غیر مسلم ہندوستانیوں کی طرح وہ اس تعلیم سے محروم ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ مدرسوں کا متبادل انتخاب کرتے ہیں جو انہیں مرکزی دھارے سے اور زیادہ الگ کر دیتا ہے۔مزید براں مدرسوں میں دیگر پیشوں کے حوالے سے مناسب تیاری نہیں کرائی جاتی اور زیادہ تر یہاں پر معلم اور مساجد کے امام ہی تیار کیے جاتے ہیں۔چنانچہ ان کی جانب سے مسلمانوں کے لیے اختیار کے بجائے مسلم مذہبی اور ثقافتی شناخت پر زور دینے کے باعث وہ تعلیمی اور معاشی مواقع میں طاقت حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

خوشحال لوگوں میں تعصب کے تباہ کن اثرات اور غریب لوگوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے اکثریتی رائے عامہ میں یہ تاثر پیدا ہو چکا ہے کہ مسلمان اپنی ثقافتی وجوہات یا غربت کے باعث جدید تعلیم کو مسترد کرتے ہیں۔ اعداد وشمار اس کے برعکس ہیں۔سرکاری فنڈز سے چلنے والے سیکولر تعلیمی اداروں میں غیر مسلم بچوں کے مقابلے میں مسلم بچوں کے داخلوں کی رفتار میں اضافہ ہو چکا ہے۔نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن کی جانب سے 1999-2000 اور 2004-2005 میں جمع کیے جانے والے اعدا وشمار کے مطابق دیہاتی علاقوں میں مسلم لڑکوں (پانچ سے چودہ سال کے بچے) میں داخلے کی شرح میں بارہ فیصد اضافہ ہوا جبکہ غیر مسلم بچوں میں یہ شرح نو فیصد پائی گئی۔ لڑکیوں کے لیے یہ اعدادوشمار مسلمانوں میں سولہ فیصد اور غیر مسلموں میں تیرہ فیصد رہے۔اس اضافے نے ہندوؤں کے ساتھ فرق کو کم کر دیا۔2004-05 میں 76 فیصد مسلمان لڑکے اور 71 فیصد مسلمان لڑکیاں سکولوں میں پڑھ رہے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں ہندوؤں میں یہ تناسب لڑکوں میں 84 فیصد اور لڑکیوں میں 71 فیصد تھا۔شہری علاقوں میں مسلم اور غیر مسلم لڑکوں میں اضافے کی شرح برابر تھی جبکہ مسلم لڑکیوں میں دوسروں کے مقابلے میں اضافہ کی شرح دوگنی ہوگئی تھی۔

ان اعداد وشمار سے ہمیں فراہم کی جانے والی تعلیم کے معیار کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا جو سرکاری سکولوں میں عام طور پر کمتر نوعیت کی ہوتی ہے۔ اور جن سکولوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہوتی ہے وہاں اور بھی زیادہ کمتر معیار کی حامل ہوتی ہے۔ایک

MashalBooks.org

اور بدترین چیز برابر کی تعلیم کے حامل مسلم اور غیر مسلموں میں ملازمت کے مواقع میں نابرابری ہے۔دیہاتی اور شہری علاقوں میں مسلمان گریجویٹس میں بیروزگاری کی شرح ہندوؤں سے دوگنی ہے۔اس وجہ یا کسی اور وجہ سے،مسلمانوں میں سیکنڈری سطح کی تعلیم سے آگے پڑھنے کی شرح دیگر مذاہب کے لوگوں کے مقابلے میں قابلِ ذکر حد تک کم ہے۔اس عرصے کے دوران شہری علاقوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی شرح میں بھی کمی ہوئی۔

نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن کے حوالے سے ایک نیوز رپورٹ سے خشک اعداد وشمار اور روزانہ کی خبروں کے درمیان ایک تعلق بھی سامنے آتا ہے۔اس رپورٹ میں جامعہ نگر، جہاں سے حال ہی میں پولیس نے ایک مشتبہ دہشت گرد کو گرفتار کیا تھا، کے ایک رہائشی کے الفاظ کو نقل کیا گیا۔اس کا کہنا تھا :''بہت سے پڑھے لکھے مسلمان لڑکے اپنا سارا دن چائے کی دکانوں پر گذارتے ہیں۔کون جانتا ہے کہ ان کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔''

ثقافتی خودمختاری ختم ہونے کا خوف معیاری جدید تعلیم کو مدرسوں میں نہ لانے میں ایک قابل ذکر رکاوٹ ہے۔تاہم اس کے باوجود مدرسوں میں جدید سیکولر تعلیم متعارف کرانے اور ان کے نصاب اور تعلیمی مواد کو قواعد میں لانے کے لیے اقدامات کئے جاچکے ہیں۔ ان کوششوں میں گذشتہ سال نیشنل ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ کے سروشکشا ابھیان (ایجوکیشن فار آل)سکیم کی اعانت سے دہلی میں مدرسوں کو جدید بنانے کی سکیم بھی شامل ہے۔اس میں وزارتی پول سے ٹیچرز کی اسائنمنٹ اور سائنس اور انگریزی تدریس کے لیے مدرسوں کے ٹیچرز کی تربیت شامل ہے۔حکومت کی جانب سے تیارکردہ ایک مسودہ قانون کے تحت مجوزہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے زیراہتمام نصابی مواد اور معیارات کی ریگولیشن کے جواب میں فنڈز فراہم کیے جائیں گے۔یہ بات بھی تسلیم کی جانی چاہیے کہ سرکاری فنڈز سے چلنے والے سکولوں میں غیر معیاری سیکولر تعلیم کی وجہ سے ان کوششوں کو زیادہ کامیابی نہیں مل پارہی۔

اکثر مدرسوں کا معیار کمتر ہے اور ان کے نصاب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کو ثقافتی اور علمی طور پر الگ کرنا چاہتے ہیں۔حکومت کی جانب سے ان مدرسوں کو ریگولیٹ کرنے اور ان کے معیار کو بہتر بنانے کی کوششوں کے امکانات یا نتائج غیر یقینی رہتے ہیں۔تاہم عوامی اقدامات کی سطح پر حوصلہ افزاء جوابی مثالیں ملتی ہیں۔ مذہبی علماء کے

MashalBooks.org

سرکردہ اور ممتاز اداروں جیسے جمعیت علمائے ہند (جے یو ایچ) مدرسوں میں اصلاحات میں خاصی پیش رفت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اپنی کوششوں کے ضمن میں مدرسے دہشت گردی اور دیگر مسائل پر سیاسی مباحث اور مذاکرے منعقد کر چکے ہیں جن کا غیر مسلم سیاسی اور سماجی کارکنوں، صحافیوں اور مذہبی علماء نے خیر مقدم کیا ہے۔

شاید یہ بات بھی بہت اہمیت کی حامل ہے کہ مسلم مذہبی مدارس کی بہتری کے لیے بین المذہبی تعاون کی مثالیں تیار کی جائیں۔جمعیت علمائے ہند اور ایک سکیولر تنظیم ''جن وکاس'' کے درمیان اشتراک کے نتیجے میں جیون تعلیم پراجیکٹ سامنے آیا جس کا مقصد گجرات میں مسلم مدرسوں کے معیار کو بہتر بنانا تھا۔ جن وکاس جو سماجی طور پر غیر مراعات یافتہ طبقات بشمول مسلمانوں کے لیے پرائمری تعلیمی اصلاحات کے حوالے سے طویل عرصے سے کام کر رہا ہے اس کی صلاحیتوں اور علماء کی صلاحیتوں کے باہمی اشتراک سے مذہبی اور ثقافتی تشخص اور تعلیمی معیار کے درمیان ایک تعلق قائم کرنے میں مدد ملی ہے۔

اس قسم کے اقدامات ایک ایسے سیاسی ماحول میں خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں جب دیگر سماجی طور پر غیر مراعات یافتہ گروہ گجرات فسادات کے بعد مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کا مظاہرہ کرنے سے گریز کرنے لگے کیونکہ انہیں خدشہ ہے کہ بڑھتے ہوئے مسلم مخالف جذبات کی وجہ سے انہیں اس سے نقصان ہوسکتا ہے۔

MashalBooks.org

غیر یقینی اعداد وشمار

اگر چہ نامکمل اور مکمل طور پر قابل بھروسہ نہ ہونے کے باوجود پبلک سروس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے حوالے سے کچھ سرکاری اعداد وشمار موجود ہیں تاہم دیگر آبادیاتی اعداد وشمار موجود نہیں۔ سچر کمیٹی رپورٹ جو کہ ممکنہ طور پر اب تک تیار کیا جانے والا جامع ترین جائزہ ہے وہ اعداد وشمار کی قلت کے مسئلے کا اعتراف کرتی ہے۔ سچر رپورٹ کا کہنا ہے کہ اعداد وشمار جمع کرنے کے لیے ایک قومی ادارے کی ضرورت ہے۔ حقائق کے بارے میں غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے اضطراب میں اضافہ ہوتا ہے۔ صحیح حقیقی صورت حال کے یقینی نہ ہونے کی وجہ سے اس اضطراب کو موثر طریقے سے حل کرنا تو بہت بڑی بات ہے، سمجھنا بھی مشکل ہے۔

ہندوستان بھر میں متعدد مسلمان کمیونیٹیز اور آبادیوں کی سماجی مارجنلائزیشن سے یہ مسئلہ اور گھمبیر ہوجاتا ہے۔ بہت سے مسلمان اپنا روزگار روایتی پیشوں سے کماتے ہیں جن کے بارے میں اعداد وشمار مبہم ہیں۔ روایتی قسم کے پیشوں میں ان کی شمولیت اور غیر رسمی معیشت میں ان کی کمتر نمائندگی سماجی پالیسی کے لیے جدید سماجی سائنسی ٹولز میں مسلمانوں کو کم نمایاں اور کم اہم بناتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پالیسی ٹولز کے نقائص ایک ایسی رکاوٹ کا کردار ادا کرتے ہیں جو ریاست کی جانب سے ان کے لیے واضح اور متفقہ ترجیحات، جیسے تعلیم تک رسائی، کے تعین میں حائل ہوتی ہیں۔ ایسی آبادیوں کے لیے سرکاری سکولوں کی مناسب تعداد اور قیام کے سلسلے میں پلاننگ دوگنا مشکل ہوجاتی ہے۔

اگر چہ مسلمانوں کے لیے تعلیمی مواقع تک مساوی رسائی سے انکار کے ضمن میں ریاستی امتیاز یا منفی رویے کو نظرانداز کرنا ایک خطرناک عمل ہوگا تاہم اس کے ساتھ یہ بھی اہم ہے

کہ ان تمام قابلِ ذکر اسباب کو بھی دیکھا جائے جو ان کے نقصان کا باعث ہیں۔

MashalBooks.org

ان کی اپنی آواز میں

''مسلمان نوکریاں چاہتے ہیں، افطار نہیں۔''
''سرکاری وسائل کو مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کرو، حج سبسڈیز پر نہیں۔''

نتائج اور مرکزی موضوعات کا خلاصہ

سٹمسن انسٹی ٹیوٹ فار پیس اینڈ کونفلکٹ ریزولوشنز سٹڈی کا مقصد فوکس گروپس اور انٹرویوز کو ایسے ذرائع کے طور استعمال کرنا نہیں ہے جس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کی معروضی حقیقت کا اندازہ لگایا جائے۔ایسی کئی منظّم سٹڈیز موجود ہیں جن کا دائرہ بہت جامع ہے یا جن میں ایک یا کسی دوسرے اہم پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ان میں سے کئی بالکل حالیہ ہیں۔حالیہ عشروں کے دوران مرتب کی جانے والی یہ سٹڈیز اوران کے ساتھ دیگر سٹڈیز معروضی حقائق کی چھان بین کے سلسلے میں ایک ضروری بنیاد فراہم کرتی ہیں۔اس کے لیے گوپال سنگھ، سری کرشنا، لابیر ہان، مشرا اور سچر رپورٹ کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے بجائے ہماری سٹڈی کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مسلمانوں کی جو حالت ہے اس سلسلے میں خود ان کے تاثرات کیا ہیں۔رپورٹ میں جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے ان میں خود مسلمانوں کے نزدیک سب سے اہم ترین مسئلہ کون سا ہے اور خود وہ کیا دیکھتے ہیں کہ یہ مسائل کیا شکل اختیار کررہے ہیں۔اگرچہ ہم نے جن مسائل کو اٹھایا ان کے بارے میں متعلقہ افراد کی سوچ میں اختلاف پایا گیا تاہم اس عمل کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل کے بنیادی اسباب کے بارے میں ایک قابل ذکر اتفاق رائے سامنے آیا۔

ایک مجموعی تصویر جو سامنے آئی وہ ایک ایسی کمیونٹی کی ہے جسے شدید قسم کے چیلنجز کا سامنا ہے۔مجموعی آبادی میں اپنے تناسب کے مقابلے میں اس کمیونٹی میں غربت اور معاشی

مسائل دوسروں سے زیادہ ہیں۔ پبلک سروسز، انتظامیہ، پولیس فوج اور سفارت کاری میں اس کی نمائندگی بہت کم ہے۔ یہ سیاسی طور پر کمزور اور منقسم ہونے کا احساس رکھتی ہے۔ یہ خوف کے اس احساس کے باعث غیر متحرک رہتی ہے کہ اگر اس نے پوری طاقت سے اپنے مسائل کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کے نتیجے میں ردعمل سامنے آئے گا اور یہ اس وجہ سے اضطراب کا شکار رہتی ہے کہ اکثریتی معاشرہ اس کے مسائل کی طرف توجہ دینے پر تیار نہیں۔

رپورٹ کے اہم ترین نتائج درج ذیل ہیں:

☆ غالب ترین مسئلہ تعلیم ہے اور اس کے ساتھ قریبی طور پر جڑا ہوا مسئلہ معاشی مواقع کا ہے جو انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمانوں کے مفاد سے متعلق ہے۔اس سے ہندوستان میں پائے جانے والے اس عمومی تاثر کی نفی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ ان کا ثقافتی یا نظریاتی تشخص ہے۔

☆ مذہبی ایشوز اس بحث اور تحفظات کے ضمن میں بہت معمولی حیثیت کے حامل ہیں۔ مذہبی شناخت کی بنیاد پر غیر مساوی برتاؤ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

☆ دیگر جن بنیادی چیزوں پر زور دیا جاتا ہے ان میں قانونی کی حکمرانی اور ہجوم کے تشدد (mob violence) یا ریاستی اداروں جیسے پولیس اور عدالتوں کی جانب سے ناانصافی سے تحفظ ہے۔

☆ مقبول غیر مسلم تاثر کے برعکس ہندوستانی مسلمان بھی اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کی طرح تعمیری سوچ رکھتے ہیں اور اپنی بہتری اور صبر و برداشت پر زور دیتے ہیں۔

ہندوستان میں ایک ایسی سوچ پھیل رہی ہے کہ غیر مسلم ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور نقطۂ نظر سے آگاہی نہیں رکھتے یا وہ ان کے معاملے میں عدم دلچسپی اور مخالفت کا رویہ رکھتے ہیں۔ یہ سوچ بھی موجود ہے کہ ہندو سوچ کے ارتقاء میں مسلم مخالفت بڑھ رہی ہے اور یہ کہ ہندوستانی تاریخ اور سماج میں مسلمانوں کے کردار کو حملے کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور یہ کہ قومی سیاسی مباحث میں اکثریت خصوصی طور پر غالب ہو رہی ہے۔مسلمانوں کا تاثر، جو کبھی اکثر ہندوستانیوں کے لیے قومی اور ثقافتی طور پر قابل فخر تھا، اب آہستہ آہستہ یہ بن رہا ہے کہ وہ غیر متعلقہ ہیں اور بدترین یہ کہ وہ ابھرتے ہوئے نئے بھارت کے سیلف

MashalBooks.org

امیج کے حوالے سے کسی قسم کا چیلنج ہیں۔ یہ تاثر بھی کوئی زیادہ ڈھکا چھپا نہیں کہ مسلمان انٹی نیشنل اور در پردہ پاکستان کے ہمدرد ہیں۔

مسلمانوں کے بارے میں اس قسم کے تاثرات کو قبولیت ملنے اور ہندو شناخت کا فاتحانہ احساس بھی خاصا بڑھ چکا ہے۔ان چیزوں سے رائے عامہ کا ماحول متاثر ہورہا ہے حتیٰ کہ ان ہندوؤں میں بھی جو شاید مسلمانوں کے خلاف تعصب یا مخالفانہ جذبات کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ان کی جانب سے اقلیتوں کو خوش کرنے کی بات کر کے مزاحمت کے سلسلے میں ایک جواز پیدا کیا جاتا ہے جبکہ مسلمانوں کے جو حقیقی تجربات ہیں اس میں خوش کیے جانے کے سوا سب کچھ شامل ہے۔ وہ تو الٹا تعصب کا نشانہ بنائے جانے کا احساس رکھتے ہیں۔

پاکستان کی بنیاد پر تنگ نظری کے حامل تشخص کے برعکس تقسیم سے پہلے کے سیکولر ہندوستان میں مسلم ہندو ثقافتی ورثے کے حوالے سے غالب حد تک قوم پرستی کا جو فاخرانہ احساس تھا اس کی جگہ اب شکوک وشبہات نے لے لی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ورثے کو جس طرح منایا جاتا تھا، اب اس کی جگہ ثقافتی عناد نے لے لی ہے۔ آزادی کی قوم پرستی کے تناظر میں کی جانے والی جدوجہد میں اہم اور ممتاز مسلمان قائدین کے کردار کو اب فراموش کیا جارہا ہے اور اس احساس کو فروغ مل رہا ہے کہ مسلمان ہندوستان کے وفادار نہیں جو اپنے محلے اور آبادیوں کو ''پاکستان'' سے موسوم کرتے ہیں اور مبینہ طور پر مخالفانہ سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ یہ شبہات مقبول تاثر کو بڑھاوا دیتے ہیں اور دانستہ یا نا دانستہ طور پر ذرائع ابلاغ اور کچھ سیاسی رہنماؤں کی جانب سے ان کو اچھالا جاتا ہے۔

ثقافتی اور نظریاتی مباحث کے دائرے سے قطع نظر ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی مارجنلائزیشن جو شکل اختیار کررہی ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

☆ ہندوستانی مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان بڑھتی ہوئی علیحدگی اور گھٹتے ہوئے باہمی روابط۔ اس کی جو شکل سامنے آرہی ہے وہ طبعی طور پر گھروں اور آبادیوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی ہے۔ اور یہ جتنی اب بڑھ چکی ہے پہلے کبھی نہ تھی جو سکیورٹی کے حوالے سے باہمی تاثرات اور دانستہ انتخاب کی عکاس ہے۔ اس کی ایک شکل یوں بھی سامنے آرہی ہے کہ بہت سے ہندو اب اپنے مسلمان ہندوستانی ہم وطنوں کی جان و مال کے سلسلے میں دلچسپی کھو رہے ہیں۔ ہندوستان کا ملا جلا کلچر بہت پرانا ہے جس پر

بڑے فخر کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اور جس میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کرتے تھے اب وہاں مسلمانوں کے اس تشخص کے حوالے سے بغض و عناد جنم لے رہا ہے۔ ہندو اب اپنے تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کے دوران مسلمانوں کے جذبات کو جان بوجھ کر بھڑکاتے ہیں اور ان کو ان میں مدعو کرنے کے بجائے باہر رکھتے ہیں۔

☆ معاشی رجحانات کے باعث ہونے والی مسلم مارجنلائزیشن، معاشی تبدیلیوں کا جو سلسلہ شروع ہے اس سے تمام غریب اور معاشی طور پر کمزور طبقات پر اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس میں بھی مسلمان سب سے زیادہ نقصان میں دکھائی دے رہے ہیں۔ کسی حد تک اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ غریبوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اور ہندوستان کی معاشی ترقی نے جو سمت اختیار کی ہے اس سے بھی زیادہ تر وہی روایتی پیشے متاثر ہوئے ہیں جن سے مسلمان وابستہ ہیں۔ اسی اثناء میں شہریوں کو اس قسم کے دھچکوں سے بچانے کے لیے ریاست کا جو کردار ہے وہ بھی کمزور ہے۔ معاشی ترقی کے لیے تعلیم پر انحصار اب پہلے سے کہیں زیادہ ہو چکا ہے اور ہندوستانی مسلمان وہ طبقہ ہیں جنہیں تعلیمی مواقع تک رسائی میں بھی مشکلات کا سامنا ہے۔

☆ ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کی مارجنلائزیشن میں ریاستی اداروں کا قابل ذکر کردار، پبلک سروس کے اداروں جیسے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس، پولیس سروس اور پبلک سیکٹر کے انٹرپرائزز وغیرہ میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کے علاوہ ہر قسم کے سرکاری حکام میں مسلم مخالف جذبات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ اس امتیازی سلوک کی عکاسی مسلمانوں کے ساتھ عدالتی حکام، پولیس، عدلیہ اور عوامی فلاح و بہبود کے دیگر محکموں اور پرمٹ اور لائسنس جاری کرنے والے حکام کے رویے سے ہوتی ہے۔ پولیس سمیت دیگر ریاستی حکام کی جانب سے مسلمانوں پر تشدد اور ناروا سلوک کے الزامات ثابت ہو چکے ہیں۔ عمومی طور پر مسلمان اپنے جان و مال اور قانونی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں ریاستی اداروں پر اعتماد نہیں کرتے۔

☆ سرکاری اور نجی تمام اداروں میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی عدم شرکت، حالانکہ ہندوستانی آئین اور قانون کے تحت ملک کے تمام شہری برابر ہیں۔ اس کی وجہ ان کے ساتھ روا

رکھا جانے والا امتیازی سلوک اور سماجی اور ثقافتی طور پر دانستہ عدم شمولیت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اپنی عدم دلچسپی بھی ہے کیونکہ انہیں جس امتیازی سلوک اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے وہ مورال کھو چکے ہیں۔

بنیادی پالیسی ایشوز جن پر آزادی سے پہلے کے دور کے مسلم قائدین نے برابری کے مطالبات کی بنیاد رکھی تھی وہ غالب حد تک ثقافتی تشخص سے متعلق تھے جیسے خاندان اور وراثت کے قوانین، اردو زبان کی بقاء اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے مسلم تعلیمی اداروں کی اقلیتی خصوصیات کا تحفظ وغیرہ۔ مسلمانوں کا اتفاق رائے ہے کہ یہ مسائل اپنی حقیقی اہمیت کے اعتبار سے کم تر ہو چکے ہیں لیکن حکومت ان کو ہی اہمیت دے رہی ہے۔ حالیہ سالوں کے دوران فوکس اور زور اب دیگر ایشوز جیسے اختیار کی کمی، سماج میں مکمل شمولیت کی کمی اور معاشی مواقع کی کمی کی طرف ہو چکا ہے۔ آزادی کے ابتدائی دور کے بعد سے مسلمانوں کا آبادی کے حوالے سے قضیے کا تجربہ اب آبادی کے خلاف ناانصافی اور تشدد میں ریاستی گٹھ جوڑ ہو چکا ہے۔ اب یہ تاثر عام ہو چکا ہے کہ حالیہ سالوں کے دوران عوامی تشدد کے واقعات تو کم ہو چکے ہیں لیکن ان کی شدت میں اضافہ ہو چکا ہے جس کی ایک مثال 2002ء کے گجرات فسادات میں ریاست کی پشت پناہی سے ہونیوالا تشدد ہے۔ اسکے نتیجے میں بین الطبقاتی تعلقات کے حوالے سے کی جانے والی کامیاب کوششوں اور درست حالات کار کے بارے میں کمیونٹی کی سطح پر ہندوؤں کو آگاہی فراہم کرنے کے اثرات پر مایوسی کے بادل چھا گئے۔

بنیادی مسائل کے بارے میں رپورٹوں کے سلسلے، جیسے گوپال سنگھ، سری کرشنا، لائبرہان، مشرا اور سچر کمیشن رپورٹ وغیرہ، بذات خود کسی قسم کی قابل ذکر اصلاحات کا پیش خیمہ نہ بنیں اور نہ ہی اس کی کوئی امید ہے تاہم ان کے نتیجے میں خراب صورت حال کے درست پہلوؤں کے بارے میں نہ صرف مسلمانوں کے فہم میں اضافہ ہوا بلکہ ریاست کی جانب سے کارروائی میں معذوری کے باعث جنم لینے والی ان کی شکایات کی صحیح صورت بھی سامنے آئی۔ شکایات اور الگ کیے جانے کے حوالے سے ان کے فہم و آگاہی میں آنے والی تیزی کے بعد اگر کمیونٹی کی شکایات کو دور نہ کیا گیا تو سماجی تقسیم اور عدم استحکام کا خطرہ رہے گا۔

MashalBooks.org

مسلمانوں کا ثقافتی، نظریاتی اور سماجی تنوع

مسلمانوں کی، تاریخی، ثقافتی، آبادیاتی اور معاشی حالت اور ہندو مسلم تعلقات کے حوالے سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں صورت حال خاصی متفرق ہے۔ تصورات اور خیالات کا یہ فرق ہمارے مختلف فوکس گروپ ڈسکشنز اور انٹرویوز میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تعلیم، ذات، طبقے اور دیگر عوامل کی بنیاد پر مسلمانوں میں موجود سماجی فرق کا نتیجہ خیالات میں بھی تنوع کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ آخر میں دیگر تمام گروپس کی طرح مسلم کمیونٹی میں بھی فلسفیانہ، نظریاتی اور مذہبی تصورات کے حوالے سے تفرقات بہت زیادہ ہیں جس کی وجہ سے جنم لینے والی پیچیدگی جنرلائزیشن کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک بنیادی سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ''مسلم کمیونٹی'' کی اصطلاح استعمال کرنا یا ''مسلم ہندوستانیوں'' کے تجربات اور مسائل کو جنرلائز کرنا اب درست رہا ہے کہ پھر ''ہندو ہندوستانیوں'' کی اصطلاح بھی استعمال کرنا پڑے گی۔ کیا ہمیں ''ہندوستان میں مسلم کمیونیٹیز'' کے بجائے کوئی اور اصطلاح استعمال کرنی چاہیے؟ ان کو ایک ہی قسم جاننے کے بجائے مختلف علاقوں، طبقات اور کرداروں میں تقسیم کیا جائے؟ ہندوستان میں مسلم کمیونٹی کی متنوع خصوصیات مجموعی طور پر ہندوستانی معاشرے کی مختلف النوع شاندار سماجیاتی، تاریخی اور ثقافتی خصوصیات کی عکاسی کرتی ہیں۔

تنوع کا مطلب مقاصد یا افعال میں عدم یگانگت نہیں۔ اگرچہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں طرز فکر میں بڑے پیمانے پر فرق ہے تاہم ہندوستان کے مسلمانوں کو متاثر کرنے والے بنیادی مسائل پر سب کا اتفاق رائے ہے۔ تاہم مسلم قومیت کے لیے ایک واحد۔۔۔۔یا کم از کم ہم آہنگ آواز یا مربوط سیاسی قیادت تلاش کرنا بدستور ایک چیلنج ہے۔ غیر

MashalBooks.org

مناسب سیاسی نمائندگی کا مسئلہ جسے مسلمانوں کے ایک بنیادی مسئلے کے طور پر شناخت کیا گیا ہے، اس مشکل کو اور بھی بڑھاتا ہے۔ اس حوالے سے بھی اتفاق رائے موجود نہیں کہ مسلم سیاسی آرگنائزیشن اور ایڈوکیسی کس شکل میں ڈھلنی چاہیے جیسا کہ ذیل میں اس پر بحث کی جاتی ہے۔

کیرالہ میں مسلمانوں کی حالت اپنے شمالی ہندوستانی ہم وطنوں سے کچھ ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور وہ وہاں پر ہندوستان کے دیگر علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں تحفظ کا زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ سیاست کے بڑے اتحادوں میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا کردار بھی واضح ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اب یہاں پر بھی صورت حال عدم استحکام سے دوچار ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں پر انڈین یونین مسلم لیگ (آئی یو ایم ایل) کے غلبے کو نسبتاً زیادہ متنوع اور عسکریت پسند مسلم تنظیموں سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ جبکہ دوسری وجہ سیکولر ہندوستان اور کیرالہ کی سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور تیسری وجہ طبقاتی پولرائزیشن، بالخصوص ریاست کے شمالی حصوں میں، میں اضافہ ہے جہاں راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) اور دیگر انتہاپسند ہندتوا کی حامی تنظیموں کی جانب سے پیش رفت ہوئی ہے اور چوتھی وجہ مسلمان کمیونٹی میں بڑے پیمانے پر ہونے والی ریڈیکلائزیشن ہے۔

ریڈیکلائزیشن یا بنیاد پرستی کے مختلف عوامل ہیں جن میں ریاست میں طبقاتی ڈویلپمنٹ کے حوالے سے مسلمانوں کا ردعمل، قومی صورتحال کے حوالے سے زیادہ آگاہی اور دیگر مسلم دنیا سے ہونے والے نظریاتی اثرات شامل ہیں کیونکہ کیرالہ کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد خلیجی ریاستوں میں بسلسلہ روزگار مقیم ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی شکایات اور فوائد سے محرومی ویسی ہی ہے جس سے ہندوستان بھر میں دیگر کمزور غیر مسلم گروہ دوچار ہیں تاہم کیرالہ میں یہ احساس زیادہ مضبوط ہو رہا ہے۔ جس کی ایک وجہ شاید ریاست میں طبقاتی بنیادوں پر ہونے والی سیاست کی تاریخ ہے۔

منظرنامے کے دوسرے سرے پر گجرات اور آسام کے مسلمان ہیں۔ ان دونوں علاقوں میں مسلمانوں کے ردعمل کی صورت بہت مضبوط اور پرسکون ہے۔ تاہم یہ واضح ہے کہ وہ خطرے اور بحران کا شدید احساس رکھتے ہیں۔

MashalBooks.org

جہاں تک گجرات کا معاملہ ہے تو وہاں اس کی وجہ اوپر پیش کیے گئے ملک گیر پیٹرن کے خلاصے یعنی ریاستی اداروں کی طرف سے امتیازی سلوک، ایک بڑھتی ہوئی ثقافتی چشمک اور طبعی علیحدگی کی صورت حال گجرات کے فسادات اور اس کے نتائج کی وجہ سے بہت سخت شدت اختیار کر چکی ہے۔

آسام میں مسلمانوں کی جانب سے محسوس کیے جانے والے عدم تحفظ کی وجہ کی بنیادیں جن مسائل میں پوشیدہ ہیں ان میں مسلمانوں کی شدید غربت، ریاست کی نسلی آبادیاتی سیاسی پیچیدگی، آبادی میں مسلمانوں کا نسبتاً زیادہ تناسب، آسامی ہندوؤں کی جانب سے آبادیاتی عدم تحفظ کا احساس، بنگلہ دیشی لوگوں کی ہجرت اور اس کے آسامی مسلمانوں پر اثرات کے حوالے سے تشویش شامل ہیں۔ اگرچہ بار بار اس قسم کی افراتفری پھیلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آسام اگلا گجرات بن سکتا ہے تاہم دکھائی یہ دیتا ہے کہ آسام کی سیاسی ڈیموگرافی کسی حد تک اس سے تحفظ فراہم کرے گی۔ یہاں پر ریاستی اسمبلی کے 121 حلقوں میں سے 23 میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اور قانون ساز اسمبلی میں مسلمان ارکان کی سیاسی پارٹیاں منقسم ہونے کے باوجود یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ریاست میں کسی قسم کی مخلوط حکومت کے قیام کے لیے مسلمانوں کی حیثیت لازمی ہے۔

ادھر مغربی بنگال میں جس قسم کے مسائل زیادہ تر عوامی توجہ کا مرکز بنتے ہیں، جیسے صنعتی ترقی کے لیے غریب دیہاتیوں اور چھوٹے کسانوں کی در بدری وغیرہ، ان کے بارے میں بھی سمجھا جاتا ہے کہ ان کے زیادہ تر اثرات مسلمانوں پر ہی پڑتے ہیں۔ چنانچہ مغربی بنگال میں کسی بھی قسم کی سماجی پالیسی کے حوالے سے بحث میں مسلمانوں کے مسائل لازمی طور پر شامل ہوتے ہیں۔ کیرالہ کی طرح ریاست میں ریاستی طبقاتی سیاست کی طاقت اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مسائل کو دیگر طبقات کے مشترکہ مسائل کے طور پر لیا جائے۔ تاہم اس کے علاوہ ایک یہ احساس بھی موجود ہے کہ کمیونسٹوں کی موقع پرستانہ آمادگی اور بائیں بازو کی پارٹیوں کی جانب سے علامتی طور پر مسلم کاز کو گلے سے لگانے کے باوجود تمام سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کی حقیقی خراب صورت حال اور تحفظات کے حوالے سے خاموشی تماشائی بنی ہوئی ہیں۔ مغربی بنگال میں مسلمانوں کی حالت کی ایک اور منفرد خصوصیت 1947ء میں بنگال کی بھارت اور پاکستان کے درمیان تقسیم کے موقع پر ہونے والی قانون سازی کے مسلمانوں

(دفاعی)اور غیر مسلمانوں(شکوک و شبہات) دونوں پر ہونے والے اثرات ہیں۔ اور اگرچہ بنگالی مسلمانوں کے تجربات کے حوالے سے کچھ بنیادی چیزیں ہیں۔ تاہم ان کے مفادات کولکتہ اور دیگر بڑے شہروں میں آباد اردو بولنے والوں کے جیسے نہیں ہیں بالخصوص جن کا تعلق اتر پردیش اور بہار سے ہے۔

اتر پردیش جو ہندی بولنے والوں کا نام نہاد مرکز ہے وہاں پر خصوصی چیلنجز موجود ہیں۔ یہاں پر وہ علاقے موجود ہیں جو مسلمانوں کی طاقت، ثقافتی کامرانیوں اور وقار کے تاریخی مرکز کہلاتے ہیں۔ مسلم اشرافیہ بشمول متعدد جاگیرداروں اور جدید تعلیم سے آراستہ اور پیشہ ورانہ طبقات کی پاکستان ہجرت کے نتیجے میں جو مسلمان یہاں پررہ گئے وہ زیادہ تر کسان اور چھوٹے موٹے کام کرنے والے لوگ تھے اوروہ بھی قیادت سے محروم تھے۔1947ء میں اتر پردیش میں ہندوؤں کے مقابلے میں پڑھے لکھے مسلمان تناسب میں بہت زیادہ تھے۔ اب صورت حال طویل عرصے سے اس کے برعکس ہے۔

کرناٹک، آندھرا پردیش اور تامل ناڈو سماجی اور سیاسی تناظر رکھتے ہیں جہاں مسلمان نسبتاً اختیارات رکھتے ہیں جس کی سیاسی تاریخ، آبادیاتی عوامل اور حالیہ سیاسی پیش رفت جیسے تامل ناڈو میں اشرافیہ مخالف دراوڑی تحریک یا کیرالہ میں کمیونزم اور بائیں بازو کے نظریات کا غلبہ ہے۔جنوبی اور شمالی بھارت میں اخلاقی سٹیٹس، سیاسی شراکت اور مسلمانوں کی کامیابیوں کے درمیان بہت واضح فرق موجود ہے۔

مسلمان ہندوستانیوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ذات پات ایک اہم پہلو ہے جسے اکثر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔اسلام ذات پات کوتسلیم نہیں کرتا لیکن اس نے ہندوستان بھر میں پائے جانے والے اس نظام کی بہت سی خصوصیات کوقبول کرلیا ہے۔یقینی طور پر ذات پات کا نظام اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے مسلمانوں کے مفادات کو الگ کرتا ہے اور فوکس گروپس کے درمیان بحث و مباحث کے دوران اکثر یہ عنصر بھرپور طریقے سے موجود ہوتا ہے۔

ذات پات کا مسئلہ سماجی طور پر کم تر، کم تعلیم یافتہ اور غریب مسلمانوں اور نسبتاً خوشحال مسلمانوں کے درمیان مفادات کے بڑی نوعیت کے فرق کو ایک مخصوص انداز میں ظاہر کرتا ہے۔اگرچہ مسلم مخالف سماجی اور سیاسی امتیاز دونوں طبقات کو مساوی طور پر برداشت کرنا پڑتا

ہے تاہم اول الذکر مسلمانوں کا زیادہ زور ثقافتی شناخت پر نہیں ہوتا بلکہ ان کے لیے اصل مسئلہ معاشی اور تعلیمی مواقع کا ہوتا ہے جو انہیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اگرچہ غریب مسلمان مادی فوائد کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ثقافتی ایشوز جیسے مسلم پرسنل لا یا اسلام کے خلاف جرائم کے بارے میں فتویٰ سسٹم وغیرہ ان کے لیے غیر اہم ہیں۔ اس کے برعکس غریب مسلمانوں کے لیے یہ ایشوز بھی برابر کی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلم رہنما صرف ثقافتی ایشوز کی بات کرتے ہیں تو وہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔

اب اگر نسبتاً خوشحال مسلمانوں کی بات کی جائے تو ان میں بھی ایک فرق موجود ہے۔ ان میں سے ایک تو وہ مسلمان ہیں جو روایتی پیشوں اور گھریلو صنعتوں سے منسلک ہیں اور دوسرے وہ ہیں جنہوں نے جدید تعلیم سے فائدہ اٹھایا ہے اور جدید کارپوریٹ شعبے کا حصہ بن گئے۔ ان میں اول الذکر ثانی الذکر کے مقابلے میں تشخص پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

MashalBooks.org

اپنی مدد آپ اور ذمہ داری کی روح

اس بارے میں شبہ بہت کم ہے کہ سانحہ بابری مسجد کے صدمے کے بعد ہندوستان میں مسلم رائے عامہ ارتقائی عمل سے گذری جس کا نتیجہ روایتی لیڈرشپ کی جانب سے مسلمانوں کے کلچرل ایشوز جیسے اردو، مسلم پرسنل لاء اور ریاستی امداد سے چلنے والی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسائل پر زور دینے کے استرداد کی صورت میں دیکھنے میں آیا۔ اس کی جگہ اب کمیونٹی کے لیے تعلیم اور معاشی ترقی کے مطالبات نے لے لی۔

ہماری سٹڈی سے جو ایک واضح پیغام سامنے آیا وہ یہ ہے کہ کمیونٹی کی جانب سے اپنے اضطراب کے بھرپور اظہار کے باوجود اب ان میں اس چیز کی بھی آمادگی دکھائی دے رہی ہے کہ وہ اپنی فلاح کے لیے خود بھی کچھ ذمہ داری لیں۔ بلکہ ہندوستانی سماجی اور سیاسی زندگی کے دیگر پہلوؤں اور دیگر مسلم دنیا میں سیاسی اور سماجی لہر کے حوالے سے سٹمسن سنٹر کی ریسرچ سے پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم ہندوستانیوں یا غیر ہندوستانی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوستانی مسلمانوں میں مظلوم بن کر رہنے کی سوچ کو مسترد کرنے کا رجحان زیادہ ہے۔

اب ان میں غالب طور پر بیدار ہونے والے لہجے میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اس رویے کی ذمہ داری قبول کریں جس نے ان کی پسماندگی کو بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کیا اور ایسے اقدامات کریں جس سے یہ صورت حال تبدیل ہوجائے اور دوسروں پر الزام دھرنے کا رویہ ترک کیا جائے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ احساس بھی موجود ہے کہ مخالفت کے کلچر اور ریاستی اداروں اور پالیسیوں کی جانب سے مدد نہ کیے جانے کے باعث خود کو بہتر بنانے کا عمل ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہے۔

مسلمانوں کے بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ ''اپنی مدد آپ'' کی بات کرکے مسلمانوں کی وسیع تر سماج میں ناکامی کا الزام ان پر ہی عاید کیا جارہا ہے۔ دیگر کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان

اپنی بہتری کے لیے اقدامات کرنا بھی چاہیں، جیسے بہتر معیار کے تعلیمی اداروں کا قیام، تو اس کے لیے انہیں ریاست کی امداد، تعاون اور اجازت کی ضرورت ہوگی۔ ریاست کو ایک ایسے ادارے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو مسلمانوں کے اقدامات کا خاص طور پر کوئی جواب نہیں دیتی حالانکہ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ دیگر تمام ہندوستانی بھی اسی ریاستی بے اعتنائی کا شکار ہیں۔ اس سلسلے میں عمومی طور پر ''رویہ جاتی'' تبدیلی کی بات کی جاتی ہے جس میں اس بات کی ضرورت بھی بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان اپنی ذمہ داری کو جس انداز میں دیکھتے ہیں اس میں تبدیلی لائیں اور اس بات کی بھی کہ وہ مسلمانوں کے تحفظات کے بارے میں ہندوؤں کے ساتھ موثر طریقے سے رابطہ قائم کریں۔

ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ وہ تمام مسائل جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو متاثر کرتے ہیں، دیگر ہندوستانیوں کو بھی درپیش ہیں چاہے یہ غربت ہو یا معاشی تبدیلیوں سے آنے والی مشکلات ہوں یا کم تر سماجی رتبے کا مسئلہ ہو۔ ان میں صحت و تعلیم کی ناقص سہولیات، کمتر غذائیت اور دباؤ والے روزگار بھی شامل ہیں۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان کا حل قومی سطح پر کیے جانے والے اقدام میں پوشیدہ ہے۔ بہرحال یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مسائل مسلمانوں کے لیے زیادہ شدید ہیں جنہیں اپنی مذہبی شناخت کی وجہ سے اضافی نقصانات کا سامنا ہے اور یہ کہ انہیں سلامتی، شراکت اور سروسز پر مبنی سوشل پالیسیز کا مطالبہ کرنا چاہیے جن میں ان مسائل پر خاص طور پر توجہ دی جائے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ کئی مہدف پروگرامز میں مسلمانوں کو بائی پاس کیا جاتا ہے جیسے وزیر اعظم کا پندرہ نکاتی پروگرام اور یہ کہ فلاحی امداد کی تقسیم کے ضمن میں بھی مسلمانوں کو امتیاز کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

اس بات پر تواتر سے زور دیا جاتا ہے کہ غیر مسلموں کا اعتماد دوبارہ بحال کیا جائے چاہے اس اعتماد کے کھونے کی وجہ کچھ بھی ہو۔ یہ بھی فرض کرلیا گیا ہے کہ امپاورمنٹ کے لیے غیر مسلموں سے تعلقات بہتر بنانا بنیادی چیز ہے اور ایک بار پھر اس بات کو نظر انداز کردیا جاتا ہے کہ ان تعلقات کے بگڑنے کا الزام کس کے سر ہے۔ اس بات سے کسی جانب سے کوئی اختلاف نہیں کیا جاتا کہ سیاسی تنظیم سازی اور کولیشن سازی کے لیے ایک اجتماعی سوچ اپنانے کی ضرورت ہے۔

اس امر پر بھی ایک وسیع اتفاق رائے موجود ہے کہ کمیونٹی کے اندر موجود مخفی طاقت کو

MashalBooks.org

تلاش کیا جائے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور مسلمانوں کی کمزوریوں پر توجہ مرکوز کرنے سے گریز کیا جائے جبکہ اس دوران انصاف اور مناسب سماجی پالیسیوں کے لیے بھی جدوجہد بھی جاری رکھی جائے۔موجودہ ہندوستان میں بقااور خوشحالی کے لیے درکار سماجی، اخلاقی اور ثقافتی طرز فکر کے سلسلے میں مسلمانوں کی مذہبی، علمی اور تاریخی روایات سے رہنمائی حاصل کرنے کی اہمیت پر بھی خاطر خواہ زور دیا جاتا ہے۔

مسلمان جب اندرونی اداروں، بشمول تعلیمی اور ثقافتی، کے کردار اور اہمیت پر بحث کرتے ہیں تو اس میں خیراتی روایات جیسے وقف املاک اور زکوۃ کے کردار پر بار بار زور دیا جاتا ہے۔ ان کو سرکاری امداد کے متبادل کے طور پر نہیں لیا جاتااور بدستور نہ صرف نہایت ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ کم یاب اورقلت سے دوچار وسائل میں اضافے کے لیے انہیں بہت اہمیت دی جاتی ہے اور ان کو ایک لازمی وسیلے کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس کی مدد سے مسلم اداروں کو چلانے کے دوران مسلمانوں کی خودمختاری کسی نہ کسی حد تک برقرار رکھی جاتی ہے۔

مسلمان اس بات پر بھی تشویش رکھتے ہیں کہ ان روایتی خیراتی و فلاحی اداروں کی اثرانگیزی وقف بورڈ کی کرپشن، دھڑے بندی، فرقہ پرستی اور دیگر معمولی مفادات اور رقابتوں کی وجہ سے متاثر ہوتی ہے۔ وہ اس تنگ نظر ویژن سے بھی فکر مند دکھائی دیتے ہیں جس میں مسلمان اہل ثروت اپنی امداد مسلمانوں کے بچوں کو عملی فنون سکھانے والے تعلیمی اداروں کو دینے کے بجائے مذہبی مدرسوں کو دیتے ہیں۔ احتساب کی کمی اور ناقص کوالٹی کنٹرول کے باعث مذہبی تعلیمی اداروں کی اعانت متاثر ہوتی ہے۔مذہبی تعلیمی اداروں کو امداد دینے اوراس سلسلے میں رجحان کی موجودگی کے باعث بڑے پیمانے پر یہ احساس بھی پایا جاتا ہے کہ یہاں پر دی جانے والی مذہبی تعلیم کا معیار ناقص ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ پیسے کمانے کی دوڑ کی وجہ سے نجی تعلیمی اداروں میں فراہم کی جانے والی تعلیم کا معیار بھی گر چکا ہے۔

MashalBooks.org

احیاء العلوم (نشاۃ ثانیہ)

مسلمانوں میں یہ احساس بھی موجود ہے کہ ہندوستانی اسلام کی ثقافتی اور علمی زندگی میں احیاء العلوم اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کی سیاسی سرگرمی اور مسلم کمیونٹی انسٹی ٹیوشن کی تعمیر میں ضروری ہے۔ یہ بھی سمجھا جارہا ہے کہ ہندوستانی مسلم تہذیت کی عظمت روبہ زوال ہے۔

سوال چاہے سیاسی تنظیم یا وسیع تر ہندوستانی کلچر میں مسلمانوں کے مقام کا ہو، ان میں یہ احساس موجود ہے کہ ایک علمی خلاء اندرونی طور پر موجود ہے جسے پاٹنے کی ضرورت ہے۔ اس کی کچھ عکاسی تو مسلمانوں کی اس خواہش سے ہوتی ہے کہ وہ روز مرہ کی جدوجہد سے پیچھے ہٹتے ہوئے غربت، کمتر نمائندگی، میڈیا کے امتیازی سلوک کے مسائل سے نمٹنے کے لیے زیادہ سٹریٹیجک ویژن تشکیل دیں اور کچھ عکاسی تحقیق کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ہم اکثر سنتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زار کے بارے میں بہت سے آزادانہ تجزیات کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور یہ کہ مرکزی دھارے سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی تحقیقی ادارے اس کو اپنی ترجیحات میں شامل نہیں کرتے یا اسے دیگر قومی نوعیت کے مسائل کے مساوی اہمیت نہیں دیتے۔

احیاء العلوم کی آرزو اس ضرورت کی بھی عکاسی کرتی ہے کہ کمیونٹی کے اندر سے ایک تجدید شدہ علمی اتھارٹی تشکیل دی جائے جو اس تمام تنقید سے بالاتر ہو جو کہ تقریباً تمام مسلم رہنماؤں کے غیر نمائندہ کردار پر کی جاتی ہے۔اس بارے میں بھی، ما سوائے کچھ شدید نظریاتی عناصر کے، وسیع اتفاق رائے موجود ہے کہ ایک حقیقی علمی قیادت اور اتھارٹی کی

تشکیل کے لیے کٹر مذہبی نظریات، چاہے یہ مذہبی ہوں یا سیاسی، سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔اس امر کو بھی وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جا رہا ہے کہ ان آراء اور نظریات میں تنوع کی ضرورت ہے تاکہ اس کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں جو علمی احیاء ہو وہ نہایت اعلیٰ، مفید ترین اور قابل عمل ہو۔

علمی تجدید اور قیادت کی ضرورت اب نچلی سطح کے مسائل (مثال کے طور پر معاشی تبدیلیاں اوران کے مسلمانوں پر اثرات)، قومی سطح کے مسائل (پبلک پالیسی اور قومی سیاسی نظریات کا ارتقاء اور ثقافتی ردوبدل اور ہندوستانی معاشرے میں مسلمانوں کے مقام پر اس کے اثرات) اور عالمی سطح کے مسائل (عالمی اقتصادی بحران، ہوس اور ماحولیاتی خرابیوں کے حوالے سے فتوے کہاں گئے؟) تک بڑھ چکی ہے۔

بعض لوگ اس بات پر بھی سوال اٹھاتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے احیاء العلوم کو برقرار رکھنے کے لیے مناسب تعلیمی اور ادارہ جاتی فریم ورک کی کمی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ادارے کم ہیں یا علی گڑھ یونیورسٹی کی طرح کمزور ہیں۔ دیگر عورتوں کے لازمی کردار کی بات کرتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ مسلم خواتین کے لیے مناسب تعلیم نہ ہونے کی صورت میں مسلم کمیونٹی کا علمی احیاء بہت کمزور رہے گا۔

اس حوالے سے تشویش موجود ہے کہ تجدید یا اصلاحات کی صورت میں زیادہ بنیاد پرست، پان اسلامی اور ہندوستان مخالف نظریات سامنے آسکتے ہیں۔ باوجود اس کے اس امر میں بھی اعتماد اور عزم پایا جاتا ہے کہ رواداری اور شراکت کی جنوبی ایشیائی اسلامی روایات کو مضبوط بنانا چاہیے۔کئی علمی اداروں میں اس پر کام بھی ہو رہا ہے (مثال کے طور پر رضوی کالج ممبئی میں شہیب رضوی اور جامعہ ملیہ یونیورسٹی دہلی میں اسلامک سٹڈیز پروگرام کے سربراہ اختر الواسع کا کام)۔ اس طرح نظریاتی تنظیموں جیسے محمد حامد انجینئر کی قائم کردہ ''ایما ن تنظیم'' میں بھی اس پر کام ہو رہا ہے جس کے تحت ہندوستان میں بریلوی سنی طرز فکر اور تشخص کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔

دائیں بازو کے حکام کی جانب سے اسلامی تاریخ اور تعلیمات کو ہندووانہ رنگ میں ڈھالنے کے ماحول میں تاریخی ریکارڈ کو دوبارہ اپنے قبضے میں لائے جانے کی ضرورت بھی کئی مسلمان ہندوستانیوں کے لیے بہت اہم ہے۔اس ضمن میں دو نکات خصوصی اہمیت کے

حامل ہیں۔ ان میں سے ایک تو مسلمانوں کی سیاسی تنظیم سازی کی بحالی اور تشہیر کی کوشش ہے اور دوسرے مسلمانوں کے تاثر کو انٹی نیشنل ظاہر ہونے سے بچانا ہے۔ دوسری آبزرویشن یا نقطہ یہ ہے کہ اگر ہندوستانی اسلام یا ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستانی تاریخ کے تناظر میں نہ رکھا گیا تو ان کے لیے اپنی موجودہ شناخت اور افعال کی رہنمائی کے لیے واحد دستیاب جو تناظر ہوگا وہ عالم گیر اسلام کا ہوگا۔

MashalBooks.org

معاشی حالت

ہندوستان کی تقسیم کی صورت میں جو نتیجہ سامنے آیا وہ بڑی تعداد میں ہندوستان کی پڑھی لکھی اور پیشہ ورانہ مسلمان آبادی اور مسلمان تاجروں کی ہجرت تھا۔ جو مسلمان یہاں باقی رہ گئے انہوں نے روایتی معاشی اور تجارتی پیشوں کو اختیار کرلیا جو کسی حد تک کامیاب تھے جیسے دستکار وغیرہ جنہوں نے کامیابی حاصل کی اور اپنے کاروبار کو مزید بڑھالیا۔ روایتی زراعت، حتیٰ کہ چھوٹے پیمانے پر، بھی جاری رہی جس سے وابستہ مسلمانوں نے کم ترین آمدنی کے باوجود گذارہ کیا۔ دونوں قسم کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے قومیائے گئے بینکوں کی جانب سے ڈائریکٹ اور سبسڈائز قرضوں کی صورت میں ریاست کی جانب سے انہیں امداد بھی حاصل رہی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہندوستان کی مسلم آبادی کو شدید قسم کی غربت اور ناقص تعلیم کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

حالیہ سالوں کے دوران ہندوستانی معیشت کے تیزی کے ساتھ جدت اختیار کرنے اور معاشی ترقی اور ملازمتوں کی فراہمی کے سلسلے میں حکومت کے کم ہوتے ہوئے کردار کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی صورت حال اور بھی خراب ہوگئی۔ روزگار کا قابل بھروسہ ذریعہ بننے والے تمام معاشی شعبوں کے چھوٹے اور غیر رسمی حصے کمتر فائدے کے حامل ہوگئے۔

ریاستی ملازمتوں، پبلک سروس، اور پبلک سروس انٹرپرائزز میں مسلمانوں کی نمائندگی مسلسل کم رہی۔ سرکاری ملازمتوں میں کم ہوتے تناسب نے تمام سطح کے مسلمانوں کو متاثر کیا جن میں نہایت نچلے درجے کے ملازمین کی سطح کے لوگ بھی شامل ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذمہ داری تعلیمی قابلیت میں کمی کے بجائے امتیازی سلوک ہے۔

اس سے پہلے پولیس سروس کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو کسی نہ کسی حد تک مواقع مل

جاتے تھے۔ حالیہ معاشی پیش رفتوں نے اس قسم کی سرکاری نوکریوں کو بھی کم پرکشش اور کم اہم بنادیا ہے۔مسلمانوں کو جو تھوڑے بہت فوائد مل رہے تھے وہ بھی پبلک سروسز اور پبلک سیکٹر میں ملازمتوں کی کم ہوتی ہوئی تعداد اور ان کی کم ہوتی ہوئی تنخواہوں کے نتیجے میں مزید کم ہو چکے ہیں۔

مسلمان اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جس ذریعے کی شناخت کرتے ہیں وہ انہیں معیاری تعلیم کی فراہمی ہے جو طالب علموں کو روزگار اور جدید معیشت میں پیش رفت کے لیے تیار کرتی ہے۔ بڑے پیمانے پر اس بات کی بھی ضرورت کا اظہار کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے افورڈ ایبل قرضوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔ایک کمیونٹی جو خطرات سے دوچار ہے اور جس کے محلوں میں بینک تک موجود نہیں اس کے ذریعے ان کا ایک بنیادی مسئلہ حل ہوجائے گا۔

مسلمانوں کو ایک طرف تو اپنے تناسب کے اعتبار سے نقصان کا سامنا ہے اور دوسری جانب انہیں ایک اور مشترکہ مسئلے سے بھی نقصان ہورہا ہے جو کہ لبرلائزیشن اور گلوبلائزیشن سے ہونے والے اثرات سے متعلق ہے اور جس کو اکثر ہندوستانی محسوس کرتے ہیں یعنی ریاستی ملازمتوں کی کم ہوتی ہوئی اہمیت اور معیشت کے روایتی شعبوں پر جاری یورش وغیرہ۔ قیادت تک تو بہت دور کی بات، بعض مسلمان محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان کی انٹی گلوبلائزیشن تحریک میں مسلمانوں کی شرکت ہی انہیں باوجود اس حقیقت کے کہ اس سے ان کے نصب العین کو ہی فائدہ پہنچے گا اور انہیں غیر مسلموں کے ساتھ متحدہ سیاسی ایکشن کا موقع ملے گا۔

مسلمانوں کے لیے کوٹہ مخصوص کیے جانے (سرکاری ملازمتوں میں صورت حال کی بہتری اور تعلیمی اداروں میں داخلہ) یا کم ازکم عیسائی اور مسلمان دلتوں اور ''دیگر پسماندہ طبقات''(other backward classes) کے لیے ذاتوں کی بنیاد پر کوٹہ مخصوص کرنے پر پابندی کے خاتمے پر خاطر خواہ بحث کی جاتی ہے۔اس وقت مسلمان خود کو کوٹہ سسٹم کا شکار سمجھتے ہیں کیونکہ دلتوں اور دیگر پسماندہ ذاتوں کے لیے جو کوٹہ مخصوص ہے وہ مسلمانوں کے لیے دستیاب نہیں۔

اس بات کا بھی وسیع احساس پایا جاتا ہے کہ ملازمتوں، تجارت اور مشترکہ سرمایہ کاری

کے ذریعے غیر مسلموں سے معاشی تعاون کی راہ میں رکاوٹیں موجود ہیں۔مسلمان معاشی طور پر اسی وقت کسی قابل ہوسکتے ہیں جب اس قسم کا تعاون موجود ہو یا وہ بذات خود خود کفیل ہوجائیں۔اگرچہ موجودہ حالات میں موخرالذکر صورت مناسب دکھائی دیتی ہے تاہم اس سے عدم تحفظ اور امتیاز و علیحدگی کے احساس میں بھی اضافہ ہوتاہے۔مسلمانوں کے کاروبار خاص طور پر فسادات کے دوران تشدد کا آسان نشانہ ہوتے ہیں۔بہت سے لوگوں کو یاد ہے کہ مسلمان دستکاروں کو ان کی خوشحالی سے حسد کی بناء پر ہجوم کی جانب سے کس طرح نشانہ بنایا جاتا رہاہے۔

MashalBooks.org

طرز سیاست

مسلمانوں کے طرز سیاست کے لیے متعلقہ جن بنیادی عوامل کی شناخت کی جاتی ہے ان میں غیر مسلموں اور خود مختار مسلمان سیاسی تنظیموں میں سے انتخاب، دیگر کمزور گروہوں جیسے دلتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کی جانب سے سرگرم ہونے کی کامیاب مثالیں، ہندوؤں میں رائے عامہ کی صورت حال، وسیع حکومتی نظام میں حالیہ اہم سٹرکچرل رجحانات، اعلیٰ تر مسلم سیاسی قیادت کی قابلیت و بصیرت اور تاریخی سطح پر اور موجودہ زمانے میں بھی مسلمان قیادت کی جانب سے کی جانے والی تدبیری اور تزویراتی غلطیاں وغیرہ۔

یہاں پر یہ وسیع تر احساس بھی ملتا ہے کہ باہر کی جانب دیکھنے یا غیر مسلموں سے روابط قائم کرنے کے بجائے مسلمانوں کو اپنے درمیان میں سے مزید انٹر ایکشن کی ضرورت ہے۔مختلف فوکس گروپس میں جس مرکزی خیال پر بار بار زور دیا جارہا ہے وہ بھی ایک سکون کی لہر لایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس امر پر بحث کے لیے جمع ہورہی ہے کہ کیا چیز اہم ہے اور اس بارے میں کیا کرنا ہے۔

کلچرل تشخص کے لیے سیاست کی اقدار تیزی سے مشکوک ہوتی جارہی ہیں۔یہ سمجھا جارہا ہے کہ ریاست اور مسلمان قائدین دونوں کی جانب سے تشخص کی سیاست کو اہمیت دینے اور بنیادی مسائل کو نظرانداز کرنے کے نتیجے میں غیر جانبدار ریاستی اداروں اور قانون کی حکمرانی مضبوط ہونے اور اجتماعی سیاسی مفادات کی بنیاد پر طرز سیات کا عمل رک گیا ہے۔مسلمانوں کے درمیان صرف مذہبی اور ثقافتی مسائل کی بنیاد پر غصہ اور بے چینی کی بات کرکے دیگر مفادات کی بنیاد پر مسلم سیاست میں بھرپور مکالمے کو ابھرنے سے روک دیا گیا ہے۔

حقیقی سیکولر اکثریتی ہندو رائے عامہ کی بنیاد پر رائے عامہ اور تاثرات وسیع پیمانے پر

فرق کے حامل ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت سیکولر ہے اور یا پھر وہ مسلمانوں کے مسائل سے بے خبر ہے جس کی وجہ علیحدگی کی دیوار یا ان کی خاموشی ہوسکتی ہے۔ کچھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلم مخالف جذبات کے اعتبار سے صورت حال زیادہ خراب ہوچکی ہے اور یہ کہ سیکولر طرز حکمرانی پر یقین رکھنے والے ہندوؤں کا تناسب بہت تیزی سے کم ہورہا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں مسلمانوں کی ناقص سیاسی قیادت کے حوالے سے بھی بڑے پیمانے پر تشویش موجود ہے۔ یہاں تک کہ جو ایماندار، مخلص اور بے لوث ہیں ان کی توجہ کا محور بھی عارضی نوعیت کے اہداف اور جدوجہد ہیں اور ان میں اس بصیرت کی کمی ہے کہ مسلمانوں کی فلاح اور رہبتے کے حوالے سے طویل المیعاد اہداف کے حصول کے لیے طرز سیاست کو کس طرح ڈھالا جاسکتا ہے۔

مسلمان قیادت کی پرانی نسل کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ اسے عام مسلمانوں کے مسائل سے کوئی آگاہی نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ خودغرض اور ''مغرب زدہ'' ہے۔ مسلمانوں میں سیاسی قیادت کے لیے ایک ایسی نئی نسل کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے جو نہ صرف پڑھی لکھی ہو بلکہ وہ عام مسلمانوں سے زیادہ مخلص اور ان کے ساتھ بہتر انداز میں رابطے میں ہو۔ پرانی سیاسی قیادت کی جانب سے تعلیم کے بجائے سیاست پر زور دینے کے عمل کو مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

سیاست کا عمل مسلمان علماء اور دانشوروں کو اپنی طرف راغب کرنے میں تیزی سے ناکام ہورہا ہے۔ یہ بات بڑے پیمانے پر جانی جاتی ہے کہ اس کے نتیجے میں ہندوستانی سیاسی قیادت کا معیار عمومی طور پر زوال کی جانب گامزن ہے۔ سیاست میں جرائم کے در آنے اور کرپشن اور ذات پات کے نظام کے باعث اس کی برتری کے نتیجے میں بھی سیاسی قیادت کا معیار گررہا ہے اوراس سے بھی مسلمانوں کی فلاح وبہبود کو نقصان ہوا ہے۔ بیوروکریسی کے طریقہ کار اور بیوروکریٹس کے معیار کے خراب ہونے کو بھی اس کے ساتھ قریبی طور سے منسلک کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اسکے معیار کے کمزور ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے تناسب کے ذیل میں ہونے والے نقصان کے علاوہ بیوروکریسی کے کلچر میں طبقہ بندی کا دروازہ کھل رہا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ یہ احساس

بھی موجود ہے کہ ہندوستانیوں کی اکثریت اس سے متاثر ہوتی ہے گوکہ مسلمانوں کو اپنے تناسب کے اعتبار سے اس کا نقصان ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے ایک قابل عمل ماڈل کا مسئلہ بھی موجود ہے۔ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد کی بنیاد پر تنظیمی پیراڈائم مشترکہ مسائل پر مذہبی تشخص سے قطع نظر تمام ہندوستانیوں کے ساتھ ایک متحدہ کارروائی قرار پاتا ہے۔ تقسیم کے بعد کے دور میں مسلمانوں کی کانگرس پارٹی اور دیگر اتحادوں میں شمولیت نے اس اجتماعیت پر مبنی ماڈل کو کسی حد تک متاثر کیا۔ اب جبکہ سیاسی نعرے بازی، کلچر مکالمے، پالیسی سازی اور سیاسی پارٹیوں کے حسابی کتابی رویے اور ذاتی طور پر کم محفوظ ہونے کے باعث مسلمانوں میں مارجنلائزیشن کا احساس زیادہ ہوا ہے تو مسلمانوں کے تحفظ اور خوشحالی کے حوالے سے اتحادی سیاست کے فوائد کے بارے میں زیادہ سوالات اٹھنے لگے ہیں۔

مسلمانوں میں ایک وسیع اور پرزور اتفاق رائے ہے کہ ان کی جغرافیائی اور آبادیاتی تقسیم کی وجہ سے ان کے لیے اتحادی سیاست کے سوا کوئی متبادل موجود نہیں۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ کام سیکولر سیاسی پارٹیوں کے ساتھ شراکت قائم کرکے بہترین انداز میں کیا جاسکتا ہے یا جداگانہ طور پر قائم مسلم سیاسی جماعتوں کے دیگر غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ اتحاد سے ہوسکتا ہے۔ ہندوستان بھر میں پھیلی مسلمانوں کی بڑی آبادی کو دیکھا جائے تو یہ احساس موجود ہے کہ اگر مسلمان کوئی ایسا راستہ تلاش کرلیں جس کے ذریعے وہ مشترکہ مسائل پر مل کر کام کریں تو اتحادی سیاست میں نہ صرف ان کے وزن میں اضافہ ہوگا بلکہ اس کی اہمیت اور نتائج بھی بڑھیں گے۔ اس سلسلے میں ایک ماڈل جس پر اکثر بحث کی جاتی ہے وہ دلتوں اور دیگر پسماندہ طبقات کی نسبتاً کامیابی کا ماڈل ہے جسے انہوں نے تزویراتی اتحادوں کے ذریعے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو پروموٹ کرکے حاصل کیا۔

مسلمان اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ سیکولر سیاسی طاقتوں میں اتحاد قائم ہو کیونکہ وہ اسے مسلم سیاسی تنظیم کے لیے اپنی بنیادی تزویراتی ضرورت سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حالیہ پیش رفتوں کے نتیجے میں سیکولر کلچر اور نظام حکومت کو خاصے خطرات لاحق ہوگئے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سیکولر قوتیں کمزور ہوچکی ہیں اور بعض پارٹیوں

کی جانب سے سیکولر ازم کا اظہار محض برائے نام ہے اور وہ اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لیے جب ضرورت ہوتی ہے سیکولر ازم کو ترک کر دیتے ہیں اور یہاں تک کہ جو واقعی مخلص ترین سیکولر قوتیں ہیں وہ بھی ایک مستحکم سیاسی اکثریت پیدا کرنے میں ناکام ہیں۔

ہم خیال قوتوں کے ساتھ اتحاد بنانے کے لیے جو ایک مخصوص ٹاسک طے کیا گیا ہے وہ ہندوستانی سماج میں جمہوری ماحول کو دوبارہ پانے کے لیے وسیع تر ہندوستانی جدوجہد ہے جس کے لیے جمہوری رویوں اور حقوق اور قانون کی حکمرانی سے دور ہٹنے کے خلاف مزاحمت کی ضرورت پر زور دیا جائے گا۔ اس کے لیے مذہبی تشخص کے عنصر پر زور دینے کے عمل کو ترک کیا جائے گا اور اسکے بجائے شہریت کے حقوق پر زور دیا جائے گا جس سے انکار کی صورت میں مسلمان خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں جبکہ کئی دیگر ہندوستانیوں پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔

جیسا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد کے سلسلے میں مسلمانوں کی سیاسی عمل میں رہنمائی کے سلسلے میں جو نظریاتی فریم ورک ہے اس میں بعض کی جانب سے اسلامی تعلیمات کے ان اصولوں پر زور دیا جاتا ہے جن کے تحت غیر مسلموں کے ساتھ اجتماعیت پر مبنی سیاست اور یکجہتی قائم کی جاتی ہے (مدینہ میں حضرت محمد ﷺ کی جانب سے ریاست مدینہ کی تشکیل کی مثال) اور بعض کی جانب سے صرف سیکولر جمہوری اصولوں کی بنیاد پر سیاسی شراکت اور مذہبی رہنمائی کو نجی حلقے کے لیے چھوڑنے کی بات کی جاتی ہے۔ ثانی الذکر طرز فکر کا تنوع ان لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے جن کا یقین ہے کہ مسلمانوں کو پہلے اپنے اندر یک جہتی پر توجہ دینا چاہیے جبکہ کچھ اس بات زور دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس قسم کے کسی متحدہ فرنٹ کو مذہبی کے بجائے سیاسی اصولوں پر قائم ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کی سیاسی امپاورمنٹ کے لیے مذکورہ طرز فکر کی راہ میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔ مسلمانوں کی طاقت مختلف سیاسی پارٹیوں میں بٹی ہوئی ہے اور اسی طرح ان کی آواز بھی مختلف علاقوں اور کمیونٹی میں تقسیم ہے۔ حتیٰ کہ جو مسلمان سیاسی طور پر متحرک ہیں وہ بھی سیکولر پارٹیوں میں بااثر یا قائدانہ پوزیشن میں نہیں۔ لہذا سیکولر سیاست میں مسلمانوں کے ایشوز کی پہنچ اور گہرائی محدود ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی جانب سے مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ الائنس والی سیکولر علاقائی اور

قومی پارٹیوں کو متحدہ اور تزویراتی طور پر ووٹ دینے (جیسا کہ اتر پردیش کے حالیہ الیکشن میں دیکھنے میں آیا) کے مقابلے میں مسلم اور غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے مخلوط اتحاد کو حالیہ دنوں میں، ماسوائے کیرالہ کے، کم کامیاب پایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں پر انتہائی طاقتور سیکولر پارٹیوں کا مسلم پولیٹیکل پارٹیوں سے اتحاد تھا وہاں بھی دیکھنے میں آیا کہ ان کا زیادہ تر زور روزگار اور عام مسلمانوں کے دیگر مسائل کے بجائے ان کے مذہبی تشخص جیسے ایشوز پر ہی رہا۔ بایں ہمہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کیرالہ اور آسام جیسی جگہوں پر جہاں مسلمانوں کی تعداد اور ان کا اثر ورسوخ انہیں سیاست میں اہمیت کا حامل بناتا ہے وہاں بھی مسلم کمیونٹی نے سیاسی طور پر خود کو اس طرح مارجنلائز ہونے سے بچایا جس طرح وہ دوسری ریاستوں میں ہیں۔

اگر ہندوستان کی سیاست میں مختلف النوع پارٹیوں کی جانب سے اتحاد قائم کرنے کا طویل المدتی مزاج موجود ہے تو مسلمان سیاسی پارٹیوں کے درمیان سٹریٹجک اتحاد سازی بھی اسی طرح مفید ثابت ہوسکتی ہے جس طرح سیکولر پارٹیوں کو تزویراتی ووٹ دینے کا عمل مفید ہوسکتا ہے۔ یہ عمل خاص طور پر ان علاقوں میں زیادہ مفید ہوسکتا ہے جہاں مسلمان آبادیاتی طور پر فائدے میں ہیں۔ اگر کمزور اور ردوبدل سے دوچار مخلوط حکومتوں کو زیادہ مستحکم اور مسابقت والی ایسی پارٹیوں کی مخلوط حکومت سے بدل دیا جائے جو زیادہ دیر چلنے والے بڑی قومی سیاسی پارٹیوں کے اتحاد پر مشتمل ہو تو تزویراتی ووٹنگ بدستور ایک قابل عمل حکمت عملی رہتی ہے اگرچہ اس میں بھی مسلمان سیاسی پارٹیوں کو کوئی موثر کردار حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔

مسلمانوں کو ملک گیر پیمانے پر سیاسی طور پر منظّم کرنے کے لیے بھی ضرورت کا اظہار کیا جاتا رہا ہے۔ معروضی چیلنجوں کی کئی خصوصیات قومی سطح کی ہیں جیسے گلوبلائزیشن کے نتیجے میں تیزی سے آنے والی معاشی تبدیلیاں جبکہ پالیسی رسپانس، اچھا یا برا، بھی قومی سطح کا مسئلہ ہے۔ مزید براں مسلمانوں کو ہندتوا کی جانب سے درپیش ثقافتی اور رویہ جاتی خطرات کے حوالے سے ایک متفقہ قومی رجحان پایا جاتا ہے اور یہاں بھی مسلمان مخالف سیاسی قوتوں کے درمیان عملی طور پر قومی کوآرڈی نیشن دکھائی دیتی ہے جو ایک ملک گیر مسلم رسپانس کا مطالبہ کرتی ہے۔

تاہم قومیت کو منظّم کرنے کے لیے ایک افراتفری، بالخصوص وارننگ اور الارم کی باتوں

کی وجہ سے، موجود رہتی ہے۔ ''اسلام خطرے میں ہے'' کا نعرے کی اضطراب انگیز بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی فلاح اور رہتے کو درپیش خطرے کی بنیاد پر لگایا جانے والا یہ نعرہ مسلمانوں کی آخری ملک گیر جماعت مسلم لیگ کا تھا جو کہ آخر کار تقسیم کا باعث بنا تھا۔ اس قسم کی قومی مسلم تنظیموں کے حوالے سے ہندو ردعمل کا خطرہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ مسلم ایکشن کے لیے قومی اتحاد کی فوری ضرورت پر زور دیا جاتا ہے تو اس مسئلے پر تواتر سے بحث کی جاتی ہے کہ اور کون سی بنیادیں ہوسکتی ہیں جن کے لیے ایسا کیا جائے؟

ایک اپروچ یہ بھی ہے کہ جس چیز کی اصل میں ضرورت ہے وہ کوئی سیاسی پارٹی یہاں تک کہ قومی تنظیم بھی نہیں بلکہ مشترکہ مسائل کے حل کے لیے ایک قومی کوآرڈی نیشن کی ہے۔ جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک مشترکہ آواز اور مشترکہ ویژن کی ہے۔ کوآرڈی نیشن کے سلسلے میں اقدامات کی جو مثالیں پیش کی جاتی ہیں اس میں مسلمانوں کے لیے ووٹر رجسٹریشن میں اضافے کی مہم بالخصوص عورتوں، غریبوں اور مہاجرین کی شراکت ہے۔

اس کے علاوہ جو آوازیں اٹھائی جاتی ہیں وہ ہندوستانی انتخابی نظام میں بنیادی اصلاحات کی ہیں۔ مخصوص نشستوں کے انسٹی ٹیوشن کے حوالے سے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں جس میں متعلقہ گروہ چاہے وہ دلت ہو یا مسلمان، اس کا صرف ایک رکن سرو کرتا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ نظام متحدہ ہندوستان میں انگریزوں نے متعارف کرایا تھا جس کا مقصد مسلمان اقلیت کے لیے مناسب نمائندگی کو یقینی بنانا تھا۔ اب مسلمانوں کا اعتراض ہے کہ اس عمل کی وجہ سے انہیں الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ بہت سے ہندوستانی مسلمانوں کا اعتراض ہے کہ دیگر گروپوں کے لیے کئی نشستیں ان علاقوں میں مخصوص کی گئی ہیں جہاں مسلمانوں کی قابلِ ذکر آبادی ہے۔ مسلمانوں کو اقلیت کے طور پر مناسب نمائندگی دلانے اور کامیاب امیدواروں کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے اثر کو منوانے کے لیے جن طریقوں کے بارے میں بحث ہورہی ہے اس میں عالمگیر سطح کی بحث میں شامل انتخابی اصلاحات کا آئیڈیا بھی ہے۔

معیاری تعلیم۔۔۔۔اعلیٰ ترین ترجیح

ہر فوکس گروپ اور ہر مباحثے میں جس مسئلے پر سب سے زیادہ بحث کی جارہی ہے وہ معیاری تعلیم کی ضرورت اور اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو اپنی ترقی کے لیے ایک حکمت عملی کے طور اپنائیں۔لگ بھگ تمام معاملات میں تعلیم کو آج کے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سب سے اہم ایشو کے طور پر شناخت کیا گیا ہے۔یقینی طور پر یہ بات غیر مسلموں کے اس عمومی تاثر کے برعکس ہے کہ مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کے مذہبی تشخص کا ہوتا ہے۔

1992ء میں بابری مسجد کو تباہ کرنے کے واقعے کے نتیجے میں مسلمانوں کی خود اعتمادی اور احساس تحفظ کو پہنچنے والے دھچکے کے بعد ان میں اپنی خود بہتری کے عزم اور اس کے لیے تعلیم کو استعمال کرنے کا احساس بڑھا ہے اور اسی کی وجہ سے وہ صرف اپنے تشخص کے لیے سرگرم ہونے کے جذبے سے دور ہٹے ہیں۔ اس وقت سے مسلمانوں کے تجربات کئی وجوہات سے حوصلہ شکنی پر مبنی رہے ہیں۔ان میں سے کئی سمجھتے ہیں کہ تعلیم مواقع کے حوالے سے بدحال ہیں۔ بہت سے سمجھتے ہیں کہ اگر وہ تعلیم کے لیے اپنے شوق کا مظاہرہ کریں بھی تو انہیں سرکاری پالیسیوں اور مسلم اداروں کی جانب سے مایوس کن رسپانس ملتا ہے۔

مسلمانوں کی ترقی کے لیے تعلیمی مواقع کو پھیلانے اور بہتر بنانے کو کئی وجوہات سے اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ان میں سب سے اہم وجہ اس کے ذریعے روزگار پر پڑنے والے مثبت اثرات اور اس کے نتیجے میں معاشی اور سماجی ترقی ہے۔زیادہ اور بہتر معیار کی حامل پیشہ ورانہ تعلیم اور عملی ہنر کی تعلیم کی فراہمی کو بھی بہت ضروری سمجھا جاتا ہے بالخصوص

اس وجہ سے کہ اس سے غریب اور مزدور طبقے کے مسلمانوں کو ترقی کا موقع ملتا ہے۔ایک اور منفرد خواہش ان میں معیاری انگریزی میڈیم تعلیم اور عالمی معیشت کے لیے ضروری تعلیم جیسے انفارمیشن اور دیگر ٹیکنالوجیز کی دستیابی کی ہے۔

معیاری تعلیم کو موثر مسلمان سیاسی قیادت کی تعمیر اور ایک علمی ویژن اور مقصد کی کلیرٹی تک پہنچنے کے لیے بھی بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ایک سرکردہ مسلمان صحافی اس بارے میں کہتے ہیں:مسلمانوں کی مڈل کلاس تیار کرنے کے لیے جدید تعلیم ضروری ہے جبکہ موثر مسلم قیادت کی تیاری کے لیے مڈل کلاس ضروری ہے۔یہ سمجھا جاتا ہے کہ نوجوان مسلمانوں کے لیے سیاستدان، قانون دان، صحافی، سماجی ماہر اور دیگر پیشہ ورانہ وقعت کے حامل افراد بننے کے لیے مواقع، عزائم اور مثالوں کی ازحد کمی ہے۔اپنے معاشرے میں قائدانہ کردار ادا کرنے کے لیے مواقع کی غیر موجودگی کے باعث اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی مسلمان جیسے ڈاکٹر اور سائنسدان روزگار کے لیے بیرون ملک جاچکے ہیں اور یوں مسلمان کمیونٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیڈر سے محروم ہوگئی ہے۔اس کمی سے ایک سماجی جمود کی صورت پیدا ہوچکی ہے جس کی وجہ سے دیگر لوگ بھی اسی قسم کے فیصلے کررہے ہیں اور اس کے نتیجے میں مزید مسلم برین ڈرین ہورہی ہے۔

مسلمانوں کے درمیان یہ احساس پایا جاتا ہے کہ انہیں تعلیم کے حوالے سے ایک تعلیمی حکمت عملی کے ساتھ آگے آنا ہوگا جس کے ذریعے وہ نئی طرز کے حامل ہندو سکولوں کے اثرات کا مقابلہ کرسکیں،جنہیں ہندوتوا کی تنظیموں نے قائم کیا تھا اور جو مسلم مخالف جارحانہ اور مخالف ورلڈ ویو کو آگے لاتی تھیں۔ مدرسوں کی طرح یہ بھی غریب ہندو طلباء کو افورڈ ایبل معیاری تعلیم کی دستیابی کا کام کرتے تھے اور یوں ان کے پاس غریب ہندو طلباء ہی آتے تھے ..... جو اصل میں طبقاتی بنیادوں پر مسلمانوں کے فطری اتحادی ہوتے تھے ..... اور یوں ان کا رویہ ابتدائی عمروں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت سے زہریلا ہوجاتا تھا۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا مسئلہ اہمیت کا حامل ہے اور مختلف حالتوں کو سامنے لاتا ہے۔بہت مسلمان سمجھتے ہیں کہ مذہبی تعلیم نہ صرف ثقافتی تشخص کے لیے ضروری ہے بلکہ معاشرے اور حکومتی نظام میں سماجی اخلاقیات کے حوالے سے مسلمانوں کی رہنمائی کا بھی کام کرتی ہے۔بدقسمتی سے مذہبی تعلیمی ادارے اکثر نہ تو روزگار کے ہنر کے بارے میں کچھ

MashalBooks.org

سکھاتے ہیں اور نہ ہی اسلامی اقدار کے بارے میں موثر طریقے سے کچھ بتاپاتے ہیں۔ یہ اکثر روزگار اور مارکیٹ کو مطلوب ہنر کی قیمت پر مذہب پر زور دینے کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

لیکن غریب لوگوں کی جانب سے تعلیم اور سکولوں کی فیس کے متحمل نہ ہونے اور سرکاری سکولوں میں جگہ نہ ہونے اور غیر معیاری تعلیم کے باعث مدرسے ان کے لیے عملی طور پر تعلیم کا واحد دستیاب ذریعہ ہوتے ہیں۔ریاستی سکولوں میں پڑھنے کے حوالے سے دیگر مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ان سکولوں میں انہیں جو نصاب پڑھایا جاتاہے ان میں ہندوستانی تاریخ اور سماج میں مسلمانوں کے کردار کو نظر انداز کیا گیا ہوتا ہے اور ہندوستانی شناخت اور معاشرے میں ان کے مقام کے حوالے سے ان کی اہمیت کو کم کیا گیا ہوتا ہے۔بہت سے اساتذہ اور سکول کے دیگر حکام کی جانب سے مسلم مخالف تعصب بھی کو ایک اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔

مسلمان جب اپنی کمیونٹی کے لوگوں کے لیے جدید اور معیاری تعلیم کی فراہمی کے سلسلے میں ادارے قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو سکولوں کے نظام میں سیاسی مداخلت، فنڈ فراہم نہ کرنے اور دیگر قانونی اور ضابطے کی کارروائیوں کی صورت میں ان میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔بہت سے مسلمان اسکے بجائے مدرسوں کے نصاب کو معیاری اور جدید بنانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ روزگار کے حصول کے سلسلے میں انہیں زیادہ موثر بنایاجائے اور انہیں مخلوط معاشرے اور جدید دنیا کے لیے مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی اقدار سے روشناس کیا جائے۔

مدرسوں کی تعلیم کاایک اور اہم نظریاتی تناظر یہ ہے کہ کچھ ترقی پسند سیکولر بھی سمجھتے ہیں کہ مذہبی مدرسے بھی آزادی اور اختراع کا ایک ذریعہ ہیں۔کہا جاتا ہے کہ مذہبی تعلیم کی تحریک کا اصل مقصد آزادی تھا۔اس کا مقصد ان لوگوں کو بااختیار بنانا تھا جو تدریس کے روایتی طریقے سے تعلیم حاصل کرنے میں خود کو ناکام پاتے ہیں۔ان مدرسوں میں کچھ اچھے نتائج بھی دیتے ہیں لیکن اکثر اس میں ناکام رہتے ہیں لیکن اگر ان اداروں کو بالکل رسمی بنادیا جاتا تو اچھے نتائج ناممکن ہوجاتے۔

MashalBooks.org

قانون کی حکمرانی

تعلیمی مواقع اور معیار کے مسائل کے بعد جس مسئلے پر سب سے زیادہ گفتگو کی جاتی ہے وہ مسلمانوں میں بڑھتا ہوا خوف اور عدم تحفظ ہے جو کہ ریاست کے بڑھتے ہوئے مخالفانہ رویے اور ہم وطن شہریوں کی بے اعتنائی سے جنم لیتا ہے۔ ان مسائل کے حوالے سے مسلمانوں کے تاثر اور ان کے مخالفین کے درمیان ایک پریشان کن فرق پایا جاتا ہے۔ مسلمان ریاستی اداروں اور حکومت کی جانب سے بڑھتے ہوئے امتیازی سلوک کے باعث خود کو محصور سمجھتے ہیں جبکہ ان کے مخالفین قرار دیتے ہیں کہ قانون کی حاکمیت کو سب سے زیادہ خطرہ عدم وفاداری اور دہشت گردی پر آمادگی کی شکل میں مسلمانوں کی جانب سے ہے۔

مسلمانوں میں عدم تحفظ کی مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ جسمانی تحفظ اور جائیداد اور معاشرے میں کسی کے مقام کے حوالے سے عدم تحفظ ان میں امنگ کی کمی پیدا کرتا ہے اور ایک قسم کے سماجی ڈپریشن کو جنم دیتا ہے جو نوجوانوں میں جوش و جذبے اور توقعات کو کمزور کرتا ہے۔ مسلمان نوجوانوں کو ان کے خاندانوں کی جانب سے پڑھانے کے لیے بھی کم پیسہ خرچ کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے پڑھنے لکھنے کی صورت میں بھی کم ہی کوئی فائدہ دکھائی دے رہا ہوتا ہے جس کی وجہ مسلم نوجوانوں کو مساوی روزگار اور معاشی مواقع کی عدم فراہمی ہے۔ حساس علاقوں میں تو یہ احساس اور بھی زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ یہ ان علاقوں میں انفرادی یا کمیونٹی کی سطح پر تعلیم کے حوالے سے مسلمانوں کی پیش رفت کے باعث ردعمل کو جنم دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کو پولیس کی جانب سے دہشت گردی کے شبے کی آڑ میں تنگ کیا جاتا ہے۔ پولیس میں مسلمانوں کے خلاف تعصب اور مسلم نوجوانوں

کے خلاف پولیس تشدد اور استحصال کی شکایات بھی عام ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اور انہیں تنگ کیا جانا اس لیے بھی عام ہے کیونکہ ان کے خلاف یہ عوامی تاثر بڑھ رہا ہے کہ ہندوستان میں ہونے والی دہشت گردی اصل میں مسلمانوں کی وجہ سے ہے اور دیگر جو مسلمان ہیں وہ اگرچہ بے گناہ ہیں لیکن دہشت گردوں کے ساتھ ہمدردی کا رویہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا یقین ہے کہ اس تاثر کو ریاست اور میڈیا کی جانب سے بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ دہشت گردی کا شکار ہونے والوں کے لیے ریاست فوری اور موثر طور پر مدد کو آتی ہے لیکن جب ہجوم کی دہشت گردی کی صورت میں مسلمان نشانہ بنتے ہیں تو ایسا نہیں کیا جاتا۔ میڈیا دہشت گردی کے واقعات کو خوب اچھالتا ہے لیکن ہجوم کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف تشدد کے واقعات پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے اور اس کے لیے بہانہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے فرقہ واریت بڑھے گی۔

مسلمانوں کے خلاف مجمع اور پولیس کے تشدد میں اضافے کو مسلمانوں اور دیگر طبقوں کے درمیان طبعی اور ثقافتی علیحدگی کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے بھی فروغ مل رہا ہے جس کے لیے ''نسلی علیحدگی'' (aparthied) کی اصطلاح کا استعمال بڑھ رہا ہے۔

مسلم تشخص کی علامات جیسے داڑھی اور مخصوص لباس کے خلاف نفرت اور بیزاری کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔ ہاؤسنگ کے سلسلے میں امتیازی سلوک اور خوف کے باہمی احساس کے باعث بھی مسلمانوں کو الگ تھلگ کیے جانے کا احساس بڑھ رہا ہے۔ ہاؤسنگ کے سلسلے میں مسلمانوں کے ساتھ مساوی سلوک سے انکار کیا جارہا ہے جبکہ انہیں بینکنگ، پانی، صحت وصفائی اور ٹرانسپورٹ کے ضمن میں بھی مساوی سلوک سے محروم کیا جارہا ہے۔ اگرچہ الگ کیے جانے کے فعل سے احساس تحفظ اور کمیونٹی کے اداروں کو فروغ ملتا ہے لیکن اس سے غیر مسلموں میں مسلمانوں کے خیالات اور ان کے زندگی کے حقائق کے حوالے سے انڈرسٹینڈنگ بھی کم ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی خلاف ورزی کا امکان موجود رہتا ہے اور سب سے بدترین چیز یہ ہے کہ ہم وطنوں کی جانب سے ان پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے حقوق کو منوانے کے سلسلے میں بھی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ انسانی حقوق کے وکلاء کو مسلمانوں کی نمائندگی سے روکا جاتا ہے یا اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے بالخصوص ایسے مقدمات جو قوم مخالف سرگرمیوں کے حوالے سے ہوں۔ وکلاء اور ایماندار ججوں

کو بھی دباؤ کا نشانہ بنایا جاتا ہے جیسے کہ ان کے خلاف مسلم مخالف بلوائیوں کی ضمانت منظور نہ کرنے کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔

پولیس کا کردار خاص طور پر مسائل پیدا کرنے والا ہے۔ پولیس کے خلاف یہ تاثر بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ وہ مسلم مخالف تعصب سے بھری ہوئی ہے۔اس سلسلے میں رائے عامہ منقسم ہے کہ آیا ایسا محض مخالفت اور دشمنی میں کیا جارہاہے یا اس کی وجہ جہالت اور تعصب پر مبنی بڑھتا ہوا کلچر ہے۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ پولیس مسلم مخالف بلوائیوں کو بچانے میں ملوث ہے اوراکثر وہ بلوائیوں کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے انکار کردیتی ہے یا پھر وہ ایف آئی آراس طریقے سے درج کرتی ہے جس سے استغاثہ کے لیے کارروائی کرنا ممکن نہیں رہتا یا پھر وہ ایف آئی آر پر درست طریقے سے تحقیقات نہیں کرتا۔

حالیہ پیش رفتیں تلافی کے تمام امکانات کی یاد دلاتی ہیں۔ چنانچہ مارچ2008ء میں سپریم کورٹ کی جانب سے گجرات فسادات کی دوبارہ تحقیقات کے حکم سے مبصرین کو یہ یقین دہانی ملی کہ ان واقعات کے ذمہ داروں کا احتساب ہوگا۔اسی طرح کچھ مقدمات (زرینہ شیخ، بلقیس بانو) کو گجرات میں اچھے طریقے سے نہ چلانے پر انہیں دوسری جگہوں پر منتقل کردیا گیا۔

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی نقل مکانی کے واقعات نے ذاتی عدم تحفظ کے نمونوں، بالخصوص کمیونٹی کے درمیان کشیدگی کی صورت میں، شدت کو بڑھادیا۔ ایسے لوگ جرائم پیشہ عناصر اور سیاسی ٹھگوں کے ہاتھوں نشانہ بننے کے لیے آسان شکار ہوتے ہیں اورانہیں مجمع کو حرکت میں لانے کے لیے قربانی کے بکروں کے طور پر بھی استعمال کرلیا جاتاہے۔ان علاقوں کی نازک سماجی صورت حال میں یہ لوگ جرائم پیشہ مسلمانوں کے ہاتھوں بدمعاشی اورغنڈہ گردی کے لیے بھی آسان ہدف بنتے ہیں۔کسی شہری علاقے میں آنے والے مہاجرین وہاں پر موجود روزگار کے ذرائع اور دیگر معاشی مسابقت کے حوالے سے بھی کشیدگی کا باعث بن سکتے ہیں اور مذہبی تشخص کی بات کرکے اس کشیدگی کو آسانی کے ساتھ بڑھایا جاسکتا ہے۔ آخر میں یہ کہ اقتصادی طور پر ایک مارجنلائز ماحول میں بے روزگار مہاجرین کے جرائم کی دنیا میں داخل ہونے کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ حقیقت میں ایسا کہاں تک ہوتا ہے تاہم تاثر یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کے درمیان

MashalBooks.org

ناخوشگوار تاثرات میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ احساس بھی موجود ہے کہ مسلمان لیڈروں کو اپنی کمیونٹی کو درپیش مشکلات کو مخصوص انداز میں اس طرح پیش کرنا چاہیے جس سے قانون کی حکمرانی کے حوالے سے ان کی دیگر ہندو طبقوں میں مماثلت دکھائی دے اور نعرے بازی اور مہم جوئی کے لیے ان کا دیگر مسائل کے شکار گروہوں بشمول مذہبی اقلیتوں اور سماجی و معاشی طور پر نقصان سے دوچار گروہوں کے ساتھ مشترکہ لائحہ عمل ہو۔

فرقہ ورانہ تشدد کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے قانون سازی کی سرکاری کوششوں کو مسلمانوں کی جانب سے بہت کم خیر مقدم کا سامنا رہا۔ مرکزی حکومت کی جانب سے پیش کردہ ایک مسودہ قانون کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ اس میں پولیس کے اختیارات بڑھانے اور اس قسم کے حالات میں متاثرہ علاقوں میں افراد کی نقل وحرکت کو محدود کرنے کے حکومتی اختیارات بڑھانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ ایسے ریاستی اداروں جو مسلم مخالف تشدد میں ملوث پائے گئے ہوں ان کے اختیارات بڑھانے کی سوچ کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے بجائے کہا گیا کہ فرقہ ورانہ تشدد روکنے اور اس میں ملوث افراد کو سزا دینے کے لیے انڈین کرمنل کوڈ میں تمام ضروری اختیارات موجود ہیں لہذا اصل مسئلہ موجود قانون پر عمل درآمد کرنے کے حوالے سے ریاستی اداروں کی آمادگی اور صلاحیت کا ہے۔

مسلم ہندوستانیوں اور قانون کی حکمرانی کے تعلق کے درمیان ایک اضافی پیچیدگی مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے خاندانی اور وراثتی قوانین الگ ہیں اور ان کے حوالے سے کمیونٹی کے اندر بحث موجود ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ پرسنل لاء کا دوہرا ڈھانچہ مسلمانوں کے طرز زندگی کی حفاظت کے لیے ہے جبکہ دیگر کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کو قانونی مساوات سے محروم کرنا ہے۔ مسلم مخالف رائے عامہ کہتی ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ خصوصی سلوک اور انہیں خوش کرنے کی کوشش ہے۔

کچھ مسلمان کمیونٹی کی جداگانہ خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے مسلم پرسنل لاء کی تدوین کی حمایت کرتے ہیں تاکہ اسے مزید تحفظ، تسلسل، شفافیت اور باقاعدگی فراہم کرتے ہوئے کمیونٹی کے منفرد معیارات کو محفوظ کیا جائے۔ کچھ کا خیال ہے کہ جداگانہ قوانین علامتی طور پر شراکت اور شہریت کے لیے نقصان دہ ہیں اور یہ کہ ہندوستان کے تمام شہریوں کو

MashalBooks.org

قوانین کے ایک ہی مجموعے کے تحت ہونا چاہیے اور یہ کہ پورے ہندوستان کے لیے ایک ہی سول کوڈ مناسب ہے۔تاہم دیگر حلقوں کا کہنا ہے کہ تدوین نہ ہونے کی صورت میں مسلم پرسنل لاء میں اصلاحات ہونی چاہئیں تا کہ اس سے مسلم قومیت کی جانب سے اپنے طور پر اصلاحات اور جدت کی خواہش کی عکاسی کا مظاہرہ ہو۔

اس کے علاوہ سوچ کی ایک اور قابلِ ذکر لہر موجود ہے جو کہ اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ حقوق کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ پہلے وہ اپنی کمیونٹی کے اندر موجود دوسروں کے حقوق کی نفی کا مسئلہ حل کریں۔ اس میں قادیانیوں یا احمدیوں کو اپنے درمیان سے خارج کرنا حتیٰ کہ انہیں تعصب کا نشانہ بنانا، حقوق کے حوالے سے عورتوں کو کمتر سمجھنا یا مسلم اکثریتی علاقوں جیسے وادی کشمیر میں ہندوؤں کے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کرنا شامل ہے۔

MashalBooks.org

اردو زبان

ہند یورپی زبان اردو شمالی بھارت میں مقامی بولیوں اور فارسی کے درمیان ایک طویل باہمی تعلق کے نتیجے میں رابطے کی زبان کے طور پر وجود میں آئی۔لہذا یہی وجہ ہے کہ یہ زبان اپنے اندر قبل از اسلام اور اسلامی کلچر کے اہم ملے جلے تعلق کی عکاسی کرتی ہے۔اردو جو کبھی شمالی ہندوستان اور دیگر کئی شہری مراکز کی مشترکہ زبان تھی اور مذہب سے قطع نظر علم و ادب کی زبان کہلاتی تھی،تقسیم کے بعد خاص طور پر ہندوستان میں تیزی سے زوال کا شکار ہوگئی حالانکہ اسی زبان کی ایک شکل پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔

اردو کا مسئلہ،عوامی زندگی میں اس کا استعمال،سکول میں اس کی تعلیم اور ہندوستان بھر کی زبان کے طور پر اس کی بقاء کو حالیہ دنوں میں مسلمانوں کی جانب سے بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے اور ہندوستانی قومیت میں مسلمانوں کے رتبے اور فلاح کے لیے اسے نہایت ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔آزادی کے بعد سے غیر مسلموں میں یقینی طور پر یہ تاثر پیدا ہو چکا ہے کہ ا ردو خاص طور پر مسلمانوں کی زبان ہے۔ فی زمانہ اردو کے بارے میں مسلمانوں کی رائے منقسم اور مبہم ہے۔

معاشی ترقی اور مواقع پر زور دینے اوراس میں جدید تعلیم کے اہم کردار کے ساتھ مسلمانوں میں یہ تاثر بہت وسعت اختیا رکر چکا ہے کہ اردو پر زور دینے سے مسلما نوں کو نقصان ہو رہا ہے اور وہ مواقع سے محروم ہو رہے ہیں۔اردو سکولوں میں پڑھنے والے جو زیادہ تر مسلمان ہیں، اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے بہتر انداز میں تیار نہیں ہوتے۔اردو سکولوں کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ ناقص معیار کے حامل ہوتے ہیں۔اردو اساتذہ کی تربیت کمزور ہے یا سرے سے وجود ہی نہیں رکھتی۔اتر پردیش کے سکولوں میں طلبہ کو سائنس یا اردو میں تعلیم

میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں ایسا تاثر رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اردو کی افادیت کے زوال اور اردو میں تعلیم کے معیار میں زوال سے ہندوستانی سماج میں مسلم مخالف امتیاز کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ یہ چیز بھی دیکھتے ہیں کہ اترپردیش میں پبلک سروس کمیشن کے امتحانات میں اردو کو بطور اختیاری زبان خارج کیے جانے کے بعد پاس ہونے والے مسلمانوں کی تعداد تین سو میں سے چالیس سے کم ہوکر تین رہ گئی ہے۔

کچھ مسلمان سمجھتے ہیں کہ اردو خصوصی طور پر مسلمانوں کی زبان نہیں اور کچھ عرصہ قبل تک ہی یہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے ہندوستانیوں کی زبان تھی (اردو میں لکھنے والے کئی بڑے ادیب ہندو تھے) اوراس کے علاوہ ہندوستان کے کئی ایسے علاقوں جہاں مسلم کلچر بہت مضبوط ہے وہاں پر تاریخی طور پر اردو زبان کو اختیار نہیں کیا گیا جیسے کہ آسام، مغربی بنگال، کیرالہ اور گجرات وغیرہ۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے علاقوں بالخصوص اردو کے گڑھ کہلانے والے علاقوں کے دیہی علاقوں میں غریب مسلمان آج بھی اردو کے مقابلے میں ہندی بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ مقامی طور بولی جانے والی مشترکہ زبانیں ہندو مسلم ثقافتی یکجہتی کو فروغ دیتی ہیں جبکہ اردو مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے جیسا کہ گجرات کے مسلمانوں کی مثال ہے۔اردو زبان کے لیے توجہ اور وسائل کا مطالبہ زیادہ تر ان علاقوں کے مسلمانوں کی جانب سے کیا جاتا ہے جہاں اردو زبان کے خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولی جاتی ہیں جس میں اترپردیش، راجھستان اور کولکتہ (غیر بنگالی اردو بولنے والے) شامل ہیں۔ یہاں پر ایک اہم نکتے پر اتفاق رائے موجود ہے جو یہ ہے :اردو کا خاتمہ مخلوط کلچر اور اس کی بنیاد پر قائم سیکولر روایات کے استرداد کا عکاس ہے۔

MashalBooks.org

جنس

مسلم کمیونٹی کی موجودہ حالت اور مستقبل کے بارے میں جب بحث ہوتی ہے تو اس میں عورتوں کے کردار اور رتبے کے حوالے سے تواتر کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔اس سلسلے میں قابلِ ذکر متفرق آراء موجود ہیں۔قدامت پرست اور روایت پسند تاثر یہ ہے کہ روایات جیسے کہ پردہ وغیرہ عزت کے لیے ضروری ہیں اور عورت کو عظمت عطا کرتے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کے حقوق میں عورتوں کے لیے پردے کا حق بھی شامل ہے۔دیگر بشمول عورتوں کی برابری کے حامیوں کا کہنا ہے کہ عورتوں کا مسئلہ مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے ان افراد کی جانب سے اٹھایا جاتا ہے جو کمیونٹی کے خلاف مخالفانہ رویہ رکھتے ہیں۔ آزادی نسواں کے حامیوں کا ماننا ہے کہ کمیونٹی کو بیک وقت دو محاذوں پر جدوجہد کرنا ہوگی جن میں سے ایک تو بیرونی طور پر مخالفین ہیں اور دوسرا اندرونی طور پر موجود قدامت پرست ہیں۔

عورتوں کی برابری کے حامیوں (feminists) کا کہنا ہے کہ وہ دوہرے محاصرے کا شکار ہیں۔یعنی مسلمان کے طور پر بیرونی عناصر اور عورت کے طور پر اندرونی عناصر نے ان کے گرد گھیرا تنگ کیا ہوا ہے۔اس حوالے سے بھی تشویش پائی جاتی ہے کہ عورتوں کے بارے میں جب مباحثوں کا اہتمام کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد مسلمانوں کو بدنام کرنا ہوتا ہے۔بعض مرتبہ تمام قسم کے نقطۂ نظر کے حامل افراد پر مبنی مباحث کا اہتمام کرنا ناممکن ہوگیا۔لکھنوء میں تو ہمیں دو الگ الگ مباحث کرانا پڑے کیونکہ قدامت پرستوں نے حقوق نسواں کے حامیوں کو مدعو کرنے سے انکار کردیا۔تاہم کچھ لوگ اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے کہ مسلم عورتوں کی حالت بہتر بنائے بغیر مسلم کمیونٹی کی حالت میں قابلِ ذکر بہتری نہیں آسکتی۔

ایک اچھی بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ 1992-93ء کے بعد سے عورتوں کی تعلیم پر توجہ میں بہتری آئی ہے۔مسلمان لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں تعلیم کے میدان میں زیادہ

MashalBooks.org

بہتری کا مظاہرہ کررہی ہیں جبکہ ایلیمنٹری تعلیم میں لڑکیوں کی شراکت میں بھی بہتری ہوئی ہے(تاہم یہ ایک کڑوی خوشی ہے کیونکہ لڑکوں کی شراکت کم ہوئی ہے)۔ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں لڑکیوں کا آبادیاتی تناسب لڑکوں سے زیادہ ہے۔یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو حلقے طرز زندگی، جیسے عورتوں کا لباس اور پبلک پروفائل، کے حوالے سے قدامت پرست سوچ رکھتے ہیں وہ بھی اب عورتوں کی تعلیم پر پہلے سے زیادہ زور دینے لگے ہیں بشرطیکہ کہ وہ نوکریوں کی جانب نہ آئیں۔

اس حوالے سے جو منفی رجحانات موجود ہیں اس میں غیر مسلم خواتین کے مقابلے میں مسلم خواتین میں ملازمت میں شراکت میں کمی کے علاوہ مسلم خواتین صحت کے معاملے میں بھی غیر معمولی طور پر پیچھے ہیں۔ان پر گھریلو تشدد بھی زیادہ ہوتا ہے اور سروسز کے معاملے میں وہ دوہرے نقصان سے دوچار ہیں۔اس میں ایک تو مسلمان ہونے اور دوسرا عورت ہونے کی وجہ سے انہیں ہورہا ہے۔

MashalBooks.org

ذرائع ابلاغ، مقبول تاثر اوراس کی رسائی

اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کی حالت اور ان کے مسائل کے بارے میں غیر مسلموں کو بہتر طریقے سے آگاہ کیا جائے۔اسکے علاوہ بعض کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام اور قران کی تعلیمات کے بارے میں بھی بہتر انداز میں بتایا جائے۔ دیگر کا خیال ہے کہ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان علیحدگی کی جو دیوار کھڑی ہے اسے توڑا جائے۔بعض کا کہنا ہے کہ رابطے بڑھانے کی عمومی طور پر ضرورت ہے اوراس سلسلے میں گجرات کی مثال موجود ہے جہاں ان علاقوں میں جھگڑوں اور تشدد کے واقعات بہت کم تھے جہاں مختلف مذاہب کے لوگوں میں باہمی میل جول زیادہ تھا۔ تاہم گجرات میں ہمارے فیلڈ ز کے دوروں اور انٹرویوز سے یہ بات سامنے آئی کہ کراسنگ آف لائن میں مشکل بھی قابل غور ہے۔

سب حلقے اس بات سے متفق ہیں کہ مسلمانوں کے بارے میں روایتی سوچ کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔یہ رویے نہ صرف مسلمانوں کی فلاح وبہبود بلکہ ہندوستانی ریاست کے سیکولرازم اور جمہوریت کے لیے بھی زہر قاتل ہیں۔ان میں کچھ روایتی رویے یا سٹیریوٹائپ تو ثقافتی ہیں جیسے ان کا حلیہ اور گوشت کھانا اور کچھ دہشت گردی سے تعلق رکھتے ہیں۔اس بارے میں بھی اتفاق رائے موجود ہے کہ خبری ذرائع ابلاغ بالخصوص ٹیلی وژن جزوی طور پر مسلمانوں کے بارے میں روایتی سوچ کو پھیلانے کے ذمہ دار ہیں اور کسی قسم کے سیاسی حل کے لیے وہ بہت اہم ہیں۔

دہشت گرد حملے یا بم دھماکوں کا جیسے ہی کوئی واقعہ ہوتا ہے تو ٹیلی وژن جائے واقعہ کی طویل کوریج شروع کردیتے ہیں اور اموات اور تباہی کے منظر بار بار دکھائے جاتے ہیں لیکن

اس سلسلے میں تناظر کے حوالے سے باہم مربوط رپورٹنگ کی شدید کمی ہوتی ہے جس سے دیکھنے والے کو سمجھ آسکے کہ آخر ہوا کیا ہے اوراس کے پیچھے کون ہے۔ جب بھی کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو وہ ہمیشہ مسلمان ہوتا ہے اور اکثر پکا مسلمان ہوتا ہے اور اس کا حلیہ بھی بہت اسلامی قسم کا ہوتا ہے(اور اکثر اور کافی عرصے بعد یہ پکڑے جانے والے افراد شواہد نہ ملنے پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔)۔ ان کی تصاویر کو مناظر کے ساتھ ملا کر یوں پیش کیا جاتا ہے جس سے دہشت گردی کے ان واقعات کا سلسلہ مسلمانوں کے ساتھ جڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ان واقعات کے نتیجے میں مسلمانوں کو ہونے والے نقصان کی کم ہی درست تصویر پیش کی جاتی ہے۔

بعدازاں اخبارات اور ٹی وی چینلز دہشت گردی کے ان واقعات کی تحقیقات کے حوالے سے لحہ بہ لحہ رپورٹیں پیش کرتے ہیں جس میں پولیس تحقیقات کی بنیاد پر ان واقعات کے پیچھے موجود نیٹ ورک اور سازشوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے حالانکہ اس حوالے سے تمام شواہد کی بنیاد پولیس کی تحقیقات ہوتی ہیں جو معمول کے مطابق تشدد کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایک بار پھر اس میں چونکہ مسلمان ملوث ہوتا ہے جو کہ عام شہری ہوتا ہے لہذا اس سے یہ مقبول عام تاثر مزید پختہ ہوتا ہے کہ مسلمان کمیونٹی میں دہشت گردوں کے بڑے نیٹ ورک ہیں جنہیں عام مسلمان چلا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی جانب سے دہشت گردی کی مذمت کے بیانات کو ذرائع ابلاغ کم ہی نشر کرتے ہیں۔ بم دھماکوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے خلاف ہجوم یا مجمعے کے تشدد کو بھی کم کوریج دی جاتی ہے حالانکہ اول الذکر کے مقابلے میں ثانی الذکر کہیں زیادہ خوفناک اور تباہ کن ہوتا ہے۔میڈیا مسلمانوں کے بارے میں مثبت کوریج اور ان کے کارہائے نمایاں کو بھی شاذ و نادر پیش کرتا ہے اور مسلم زندگی کی بھرپور صورت ، ثقافت، معیشت اور سماج کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی زندگی کے دیگر مختلف شعبوں اور اداروں کی طرح مسلمانوں کے حوالے سے میڈیا کی ناقص کارکردگی کو بھی مسلمانوں کی جانب سے محسوس کیا جاتا ہے اور ان کے خیال میں اس سے میڈیا کی گرتی ہوئی کارکردگی اور اثر ورسوخ کی عکاسی ہوتی ہے۔اس خرابی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ابھرتا ہوا الیکٹرانک میڈیا فوری توجہ چاہتا ہے اور یوں قیاس آرائیوں کو

بڑھاتا ہے اور یہ نیا میڈیا رہنمائی اور صبر و تحمل کے حوالے سے پرنٹ میڈیا جیسے معیار اور خوبیوں سے بھی محروم ہے۔مزید براں عمومی طور پر پوری ہندوستانی صحافت بگاڑ سے دوچار ہے اور اس میں ڈیڑھ سو سال پرانا پرنٹ میڈیا بھی شامل ہے۔

اس صورت حال کو ٹھیک کرنے کے لیے تقریباً تمام لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ سیاسی طور پر آگاہی رکھنے والے مزید مسلمان میڈیا میں کیریئر اختیار کریں۔

MashalBooks.org

تشدد

ہم نے ہلکے پھلکے انداز میں سیاسی تشدد کو بھی جاننے کی کوشش کی۔ اگرچہ غیر مسلم رائے عامہ شواہد اور عکس کے بغیر یہ تاثر قائم کرنے کا رجحان رکھتی ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت عسکری تشدد کی بہت زیادہ حمایت رکھتی ہے جبکہ درست حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اپنے اندر پائے جانے والے متشدد رویے کے بارے میں بذات خود تجزیہ کرنے کا خاصا احساس اور شعور رکھتے ہیں۔ اس احساس کی دو وجوہات ہیں جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے سامنے آنے والا دہشت گردی کا کوئی بھی واقعہ پوری مسلم کمیونٹی کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتا ہے اور دوسری یہ ہے کہ ہندوستان میں گذشتہ نصف صدی سے سیاسی طور پر اور ہجوم کی جانب سے سب سے زیادہ تشدد کا نشانہ مسلمان ہی بنتے ہیں۔

مسلم رائے عامہ کی اکثریت تشدد کی کسی بھی صورت اور اس کے لیے کسی بھی سیاسی جواز کو مسترد کرتی ہے۔ اسکے بجائے ان میں اس بات پر ممنونیت کے جذبات پائے جاتے ہیں کہ وہ ایک جمہوری معاشرے میں رہ رہے ہیں جہاں انہیں آئینی اور قانونی طور پر تحفظ حاصل ہے، اگرچہ اس میں کچھ نقائص بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم مسلمانوں کی جانب سے ہندوستان کے لیے حب الوطنی، فخر اور محبت کا ضرورت سے زیادہ اظہار سنتے ہیں اور ان میں اس احساس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستان میں پاکستانیوں کی اسلامی ریاست سے زیادہ آزادی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ہزاروں گھنٹوں پر محیط مباحثوں کے دوران ہم نے یہ بات خاص طور پر دیکھی کہ اس میں جموں وکشمیر کے مسئلے کا ذکر ایک یا دو بار ہی سننے میں آیا۔ ان میں سے ایک میں ایک مسلمان نے تمام اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی جس میں کشمیری پنڈت بھی شامل تھے۔

یہاں تک کہ خالص عملیت پسندانہ پس منظر میں بھی ہندوستانی مسلمان واضح طور پر

سمجھتے ہیں کہ دہشت گردی یا اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق ان کے مفاد میں نہیں ہے۔اقلیت کے طور پر وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کس قدر آسان شکار بن سکتے ہیں اور یہ کہ اگر کسی بھی قسم کا متشدد فساد ہوا تو وہ اس میں بہت زیادہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوں گے۔

علاوہ ازیں مسلم کمیونٹی کے اندر اور تمام مکاتب فکر کے درمیان ہندو انتہا پسند وں کی جانب سے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ناانصافی کے حوالے سے شدید احساس پایا جاتا ہے۔ یہ احساس ریاست اوراس کے اداروں میں ہندوتوا سسٹم کے بڑھتے ہوئے اثرات کے باعث اور بھی بڑھتا جارہا ہے۔اس حوالے سے تشویش موجود ہے کہ اس کے نتیجے میں نوجوانوں میں ردعمل بڑھے گا اور شدید نوعیت کی مزاحمت سامنے آئے گی اور پھر اس سے مجموعی طور پر مسلمانوں کے خلاف ردعمل اور تشدد سامنے آئے گا۔ شدید نوعیت کے فرقہ ورانہ جذبات رکھنے والے افراد اور گروپوں بشمول سینئر سیاستدانوں کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف تشدد پر فخر کا اظہار کیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ردعمل اور جوابی دہشت گردی کے منحوس چکر میں اضافے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

بہت سے حلقے یہ محسوس کرتے ہیں کہ کمیونٹی کے اندر پائی جانے والی انتہاپسندی کی حامل باتوں اور بیان بازی کی پوری طاقت سے مخالفت کی ان کی صلاحیت کم پڑ چکی ہے کیونکہ پوری کمیونٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ انہیں بیرونی جانب سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ایک ایسی صورت حال میں جس میں بہت سے بے گناہ نوجوان مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے اور غلط الزامات عائد کیے جارہے ہیں اس میں بہت سے لوگ تمام مشتبہ افراد کے لیے آواز اٹھانے کو اپنے لیے عزت کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔وہ جن لوگوں کی حمایت کرتے ہیں اس میں سے جب کچھ لوگ واقعی سرگرم جہادی نکل آتے ہیں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے اور اگر ریاست کی جانب سے مشتبہ افراد کو گرفتار کرتے ہوئے ہی احتیاط سے کام لیا جائے تو شاید ایسا نہ ہو۔

نائن الیون کے بعد کی دنیا میں جہاں مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی وفاداری ثابت کریں وہاں کمیونٹی کے لیے ایک طویل المیعاد حکمت عملی اور ویژن کی تیاری بہادری کا کام ہوگا اور جہاں وہ ہجوم اور پولیس تشدد کے خلاف اپنے روز مرہ کے حقوق کے لیے

لڑتے ہوں وہاں کمیونٹی کو اپنے اندر موجود متشدد انتہا پسندوں کیخلاف کھڑا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ کچھ مسلمان دہشت گردی کی مذمت میں بار بار بیان جاری کرنے پر بھی پچھتاتے ہیں کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اس قسم کی مذمتوں کو ذرائع ابلاغ اور رائے عامہ کی جانب سے مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

اس بات پر بھی مکمل طور پر یقین کیا جانا ممکن نہیں کہ مسلمانوں میں تشدد اور انتہا پسندی کے لیے ہمدردی مکمل طور پر ختم ہوچکی ہے۔ تاہم ہماری تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہمدردی کا یہ پیمانہ بہت غیر اہم ہے اور یہ ہمدردی نکسل باڑیوں اور ماؤ باغیوں کے لیے سٹیس کو کی مخالفت کرنے والے غیر مسلموں کی جانب سے ظاہر کی جانے والی ہمدردی سے زیادہ نہیں۔ اس کے بجائے مخصوص ہندوستانی ردعمل میں جس واحد شخص نے جہادیوں کے لیے تحسین کے الفاظ استعمال کیے اس میں اس نے نکسل باڑیوں اور ماؤ باغیوں کے لیے جہادی کا لفظ استعمال کیا۔ ہم نے جن لوگوں سے بات کی انہوں نے کہا کہ دارالعلوم دیوبند کی جانب سے بار بار اور پوری شدت کے ساتھ دہشت گردی اور خودکش حملوں کی مذمت میں بیان جاری کیے جاچکے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا کہ مسلم نوجوانوں کی چھوٹی سی تعداد میں انتہا پسندی کے امکانات پیدا ہونے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے مجموعی طور پر اس کے نتائج کے حوالے سے بہت اضطراب پایا جاتا ہے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ہندوستان میں جس طریقے سے دہشت گردی کے واقعات ہوتے ہیں اور جس طرح انہیں بھڑکایا جاتا ہے اس میں پاکستان سے تعلق رکھنے والے دہشت گرد ملوث ہوتے ہیں تاہم 2007ء کے بعد سے بہت سے ایسے واقعات ہوچکے ہیں جس میں ہندوستانی اور بیشتر پڑھے لکھے نوجوان اس قسم کے حملوں کی منصوبہ بندی میں ملوث پائے گئے ہیں۔

سٹوڈنٹ اسلامک موومنٹ آف انڈیا (سیمی) کا معاملہ اہمیت کا حامل ہے۔ ''سیمی'' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ انڈین مجاہدین نامی تنظیم سے منسلک رہی ہے جو کہ متعدد بم دھماکوں کی ذمہ داری قبول کرچکی ہے۔ سیمی کی بنیاد جدید مسلم اعلیٰ تعلیم کے مرکز علی گڑھ یونیورسٹی میں رکھی گئی اور اصل میں یہ عسکریت پسند تنظیم کے طور پر قائم کی گئی لیکن حقیقت میں اس کا تعلق جماعت اسلامی ہند کی طلباء تنظیم سے بتایا جاتا ہے۔ انٹیلی جنس اور پولیس حکام

کے درمیان یہ اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ ایودھیا میں بابری مسجد کے واقعے، بمبئی سٹاک ایکسچینج پر حملے اور اسکے نتیجے میں مسلم مخالف تشدد سے پہلے اوائل1990ء کی دہائی میں ہی سیمی دہشت گردی اور سازشی سرگرمیوں میں ملوث ہوچکی تھی۔

سیمی کے حامیوں کا کہنا ہے کہ یہ تنظیم دہشت گردی کے کسی قسم کے واقعات میں ملوث ہونے سے پہلے ہی بی جے پی حکومت کی جانب سے کیے جانے والے ناروا سلوک کے نتیجے میں دہشت گردی اور سازشی سرگرمیوں میں شامل ہوئی۔ان کا کہنا ہے کہ'' ان لاء فل ایکٹی ویٹی پری وَنشن ایکٹ'' کے تحت اسے نشانہ بنایا گیا اوراس کے ارکان کو حراست اور تشدد کا شکار کیا گیا جس کے بعد اس تنظیم میں انتہاپسندی کے رجحانات پیدا ہوئے۔یقینی طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اندر سے سیمی جیسی انتہا پسند جماعتوں کے پھوٹنے کی وجہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کا یہ رویہ ہوسکتا ہے جس میں وہ دہشت گردی کے کسی بھی قسم کے واقعے، بالخصوص جس میں انڈین مجاہدین تنظیم ملوث ہو، چاہے یہ کامیاب رہا ہو یا ناکام، کے بعد پڑھے لکھے اور عسکریت پسند دونوں قسم کے مسلم نوجوانوں کو ہدف بنالیتے ہیں۔

قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ایجنسیوں نے سیمی پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ پہلے ہی کردیا تھا تاہم کہا جاتا ہے کہ ووٹ بینک کی سیاست کے باعث ایسا نہ ہوسکا۔بی جے پی کی حکومت نے2001ء میں اس پر پابندی عائد کردی تاہم2003ء میں اس پر سے پابندی ہٹالی گئی لیکن2006ء میں دوبارہ لگادی گئی۔اسی اثناء میں اتر پردیش بہار اور کیرالہ کی اہم ریاستوں کے سیاسی رہنماؤں نے الزام لگایا کہ سیمی پر پابندی لگاکر اسے نشانہ بنایا گیا۔اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اندرونی سلامتی کا معاملہ، اچھے یا برے کے لیے، ہندوستان میں مسلم سیاسی شراکت کی سیاست کا حصہ بن چکا ہے۔

MashalBooks.org

حاصل بحث

ہندوستانی مسلمان سمجھتے ہیں کہ انہوں نے تقسیم برصغیر کے موقع پر اسلامی پاکستان کے بجائے سیکولر ہندوستان کی حمایت کرنے اور اس کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ قیام پاکستان کو ایک المیے کے طور پر دیکھتے ہیں جس نے انہیں تقسیم اور کمزور کیا۔ ہندوستانی تاریخ اور ثقافت میں اسلام کے اہم کردار اور مسلمانوں کے ہندوستان بھر میں پھیلے ہونے کے باوجود وہ زبان اور ثقافت نہیں بلکہ ہندوستانی تشخص کی بنیاد پر ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔لہذا جب غیر مسلموں کی جانب سے ہندوستان کی قومی زندگی میں ان کے مقام پر سوال اٹھائے جاتے ہیں اور ان پر انٹی نیشنل اور غدار ہونے کے الزام لگائے جاتے ہیں تو وہ حیران اور پریشان ہوتے ہیں۔ ان کے پاس ہندوستان کے سوا کوئی آپشن نہیں۔ وہ، جیسا کہ وہ کہتے ہیں، ہندوستان کی ساخت کا حصہ ہیں۔

مسلم تشخص کو ختم کرنے یا اسے کمزور کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی کوشش اس قومی ساخت کو چیر ڈالے گی۔ ہندوستان میں ان کی بھرپور موجودگی اور آبادی کے باعث ہندوستان کو اپنے مسلمان شہریوں سے نباہ کرنے اور ان کے تحفظات دور کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ایک بڑی آبادی کے ریاست کے انصاف پر سے اعتماد اٹھنے کی صورت میں جو عملی خطرات ہوسکتے ہیں وہ صاف دکھائی دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے اندر اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ریاست میں ان کی شکایات کو شناخت کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔گوپال سنگھ، سری کرشنا، لبرہان، مشرا اور سچر کمیشن جیسی انکوائریوں کا قیام اس کا ثبوت ہے۔تاہم ان میں یہ احساس بھی موجود ہے کہ اس قسم کے کمیشنز کے نتیجے میں کسی قسم کی اہم اصلاحات دیکھنے میں آئی ہیں اور نہ آئیں گی۔اس لیے مسلمانوں کے لیے اصل سوال یہ ہے کہ ان پر کہاں تک اعتماد کیا جائے اور یہ کہ ان پر کیا

عمل ہوگا اور کیسے ہوگا۔مثال کے طور پر سچر کمیشن نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے ان کے سلسلے میں عملی کارروائی کا کیسے پتہ چلے گا؟ کچھ کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے قائدین اور ادارے سچر کمیشن کے نتائج کے حوالے سے غیر منظّم ہوتے رہے ہیں اوراپنے دیرینہ مطالبات کوآگے بڑھانے کے حوالے سے اس موقع کو ضائع کر چکے ہیں۔

معاشی اور تعلیمی مسائل مسلم ہندوستانیوں کے لیے غالب ترین اہمیت کے حامل ہیں جس کے حوالے سے ان میں عوامی تعصب، مخالفت، ریاست کی جانب سے لاقانونیت، ناانصافی اور جسمانی عدم تحفظ کا احساس پایا جاتا ہے۔یہ مسائل ایک دوسرے سے باہم منسلک ہیں۔ معاشی عدم تحفظ اور تعلیمی پسماندگی ان کی اس صلاحیت کو کمزور کرتی ہے کہ وہ وسیع سیاسی تناظر میں اپنے حق کے لیے کھڑے ہوں جبکہ عدم تحفظ اور ناانصافی ان کی اس صلاحیت کو متاثر کرتی ہے کہ وہ اپنی معاشی ترقی کے لیے کچھ کرسکیں۔مثال کے طور پر مجمع کی جانب سے جب بھی تشدد کا سامنا ہوا اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے کاروبار اور اداروں کو تباہی کا سامنا کرنا پڑا اور دربدری کے ہر واقعے کا نتیجہ کمیونٹی کے اداروں اور معاشی سرگرمی کے ذرائع کی تقسیم کی صورت میں برآمد ہوا۔

دہشت گردی کو وسیع پیمانے پر مسلمانوں کے ساتھ منسلک کیے جانے کے باعث ان کے روزگار اور ہاؤسنگ کے لیے مواقع پر اثرات کا سب سے زیادہ نقصان ہوا کیونکہ غیر مسلموں نے خود کو ان سے دور کرلیا۔

یہ بات بھی واضح اور بڑے پیمانے پر مانی جاتی ہے کہ معاشی اور تعلیمی حوالے سے مسلمانوں کی طرح ان کے پسماندہ غیر مسلم ہم وطنوں کو بھی مسائل کا سامنا ہے تاہم اس بات سے قطع نظر معاشی عدم تفاوت میں اضافے اور آزادمنڈی اور گلوبلائزیشن کے دیگر پہلوؤں سے بھی عمومی طور پر ہندوستانی آبادی متاثر ہوئی اور اسکے حوالے سے بھی مسلمانوں کے خصوصی طور پر تحفظات موجود ہیں کیونکہ مسلمان آبادی میں اپنے تناسب کے حوالے سے زیادہ غریب ہیں اور مسلم آبادی میں غریبوں کی تعداد بہت زیادہ ہے یا وہ ایسے پیشوں سے منسلک ہیں جو ہندوستان میں تیزی سے آتی ہوئی معاشی تبدیلیوں میں بہت زیادہ غیر محفوظ ہیں۔

روایتی مسلمان پیشے اور معاشی شعبے جو مسلمانوں کی خوشحالی اور بہتری کی بنیاد ہیں اور

MashalBooks.org

جن میں باقاعدہ تعلیم کے بجائے اپرنٹس شپ پر انحصار ہوتا ہے وہ فیکٹریوں میں تیار ہونے والے سامان کی عالمی مسابقت سے خاص طور پر متاثر ہوئے ہیں۔مثال کے طور پر اس میں مبارک پور، گورکھ پور اور بنارس کے جولاہے اور علی گڑھ کے تالہ ساز شامل ہیں۔اس وسیع پیمانے پر ہونیوالے معاشی عمل اور تبدیلیوں کے حوالے سے کچھ تو یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ریاست پالیسیوں کے ضمن میں مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کا مظاہرہ کرتی ہے جبکہ ریاست اس معاملے میں مداخلت کرکے جو کردار ادا کرسکتی ہے اس حوالے سے ان میں شدید مایوسی پائی جاتی ہے۔اس کے بجائے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریاست خود اس قسم کی معاشی تبدیلیوں کی لونڈی بنی ہوئی ہے۔

ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی مذہبی سوچ، سیاسی عسکریت اور نفرت انگیز انٹی مسلم بیان بازی کے پھیلتے ہوئے نظریاتی اور ثقافتی ماحول کے ساتھ ریاستی بیوروکریسی میں دانستہ طور پر ہندوتوا اور نظریہ سازی کی دراندازی کی جارہی ہے۔اسلامی گروپوں کی جانب سے دہشت گردی کے حالیہ واقعات سے اس رجحان میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس کا نتیجہ ریاست کی جانب سے امتیازی سلوک کی صورت میں نکل رہا ہے جو کہ پالیسیوں کی سطح پر بھی ہے اور انفرادی طور پر بیوروکریٹس کے رویے میں بھی موجود ہے۔یہ امتیازی سلوک بہت سی صورتوں میں ہے جیسے ووٹر رجسٹریشن، حکومتی گرانٹس اور سروسز تک رسائی، پولیس کی جانب سے تحفظ اور انصاف کی مساوی طور پر فراہمی وغیرہ۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانو ں کے کم تناسب کا ان کے سماجی اور معاشی رتبے پر بہت اثر پڑرہا ہے اور ان کے خلاف ریاست کے امتیازی سلوک کا یہ ایک خصوصی حوالہ ہے۔اگر سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد، بالخصوص سینئر لیول پر، زیادہ ہوگی تو اس سے انہیں خود کو بدترین تعصب سے بچانے میں مدد ملے گی۔

اس کے علاوہ مسلمانوں میں یہ احساس بھی بڑے پیمانے پر موجود ہے کہ صرف وہی اکیلے نہیں جنہیں نظر انداز کیا جارہا ہے اور جو لاقانونیت، بدمعاشی اور پولیس کے ہاتھوں تشدد کا شکار ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لاقانونیت کے حوالے سے پولیس کا ایک عمومی کلچر ہے جس سے تمام ہندوستانی، بالخصوص غریب اور سماجی طور پر غیر محفوظ طبقات، متاثر ہیں۔ تاہم یہ احساس بھی موجود ہے کہ مسلمانوں کے لیے مسئلہ زیادہ شدید ہے۔پولیس میں انفرادی اور

ادارہ جاتی طور پر انٹی مسلم جذبات بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ خوف یا اختلاف کی وجہ سے غیر مسلموں کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ یک جہتی کے اظہار یا اس قسم کے رویوں کے خلاف مزاحمت کے لیے ان کے ساتھ ملنے کا امکان کم ہوتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر لگے ہوئے دہشت گردی کے داغ کے باعث اس بات کو مسلم نوجوانوں کے خلاف دہشت پھیلانے کے لیے ایک بہانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جیسے کہ انہیں دہشت گردی کے شبے میں غیر قانونی حراست میں رکھا جاتا ہے جس میں اکثر کی بنیاد کسی شہادت کے بغیر ہوتی ہے۔ چونکہ غیر قانونی طور پر حراست میں رکھے جانے والے ان واقعات سے متاثر ہونے والوں میں پڑھے لکھے مسلم نوجوانوں کا تناسب زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان کی اس قسم کی شکایات بڑھ جاتی ہیں کہ روزگار اور معاشی سکیورٹی کو حملے کا نشانہ بنا کر مسلم خاندانوں اور کمیونٹز کی طاقت توڑی جارہی ہے۔ بعض کے نزدیک اس کو پڑھے لکھے مسلمانوں کے خلاف ایک عدم رعایت سمجھا جارہا ہے۔

مسلمانوں کے جسمانی عدم تحفظ کے نتیجے میں ان میں غیر مسلموں سے الگ ہونے کا عمل بڑھ رہا ہے اور اس بارے میں اکثر ''علیحدگی'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ مسلمان محلوں اور علاقوں کو شہری سہولیات یا تو دستیاب ہی نہیں یا ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے مثال کے طور پر پانی، صفائی، پبلک ٹرانسپورٹ اور بینکنگ کی سہولتوں سے یہ علاقے محروم ہیں۔ ہندوستان کے مسلم اکثریت والے 93 اضلاع میں یہ صورت حال بہت ہی شدید ہے۔ دیہاتی مسلمان جو ہندوؤں کے ساتھ مقابلتاً سلامتی اور اچھے تعلقات کے ساتھ رہ رہے تھے وہ بھی اب راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) اور دیگر ہندوتوا کی علم بردار تنظیموں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے متاثر ہونے لگے ہیں۔

ان تمام چیزوں کی وجہ سے مسلمانوں میں حکومت اور سماج سے دوری پیدا ہورہی ہے اور دوسرے درجے کے شہری سمجھے جانے کا احساس پیدا ہورہا ہے حالانکہ ہندوستانی آئین میں تمام شہریوں کو برابر کے حقوق فراہم کرنے کی ضمانت دی گئی ہے۔ مسلمان کے ساتھ ہندوستان میں جس قسم کا سلوک ہورہا ہے اسے بیان کرنے کے لیے وہ اکثر ''امیدوار برائے شہریت'' کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org